فہرست

شذرات	قومی تعمیر میں مذہبی قیادت کا کردار	منظور الحسن	۲
قرآنیات	البقرہ (۲: ۲۵۷-۲۵۸)	جاوید احمد غامدی	۷
معارفِ نبوی	نماز فجر کا وقت	زاویۂ فراہی	۱۱
دین و دانش	قانون عبادات (۲)	جاوید احمد غامدی	۱۵
حالات و وقائع	مسجد اقصیٰ، یہود اور امت مسلمہ (۲)	محمد عمار خان ناصر	۲۳
	عروج و زوال کا قانون (۶)	ریحان احمد یوسفی	۵۱
اصلاح و دعوت	متفرق مضامین	محمد بلال۔ محمد وسیم اختر مفتی	۵۹
تبصرۂ کتب	''کائنات کی تخلیق''	ریحان احمد یوسفی	۶۵
ادبیات	غزل	جاوید احمد غامدی	۷۰

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

قومی تعمیر میں مذہبی قیادت کا کردار

عرفان الٰہی کی وہ میراث جو ابراہیم و موسیٰ اور مسیح و محمد علیہم الصلوٰۃ والسلام نے چھوڑی ہے، وہ علما کا سرمایۂ حیات ہے۔ چنانچہ انبیا کی نیابت میں اب یہ انھی کا منصب ہے کہ اپنے ہم قوموں کو جہنم کے عذاب سے خبردار کریں اور جنت کے انعام کی خوش خبری سنائیں؛ یہ انھی کا کام ہے کہ علوم دینیہ پر غور کریں اور ان کی روشنی میں زمانے کے لیے لائحۂ عمل تشکیل دیں؛ یہ انھی کا فریضہ ہے کہ دینی تعلیم کو ہر آمیزش سے پاک کریں اور اسے دنیا کے قریے قریے تک پہنچائیں؛ اور یہ انھی کی ذمہ داری ہے کہ عامۂ امت کو انداز زندگی سکھائیں اور ان کی تعمیر و ترقی کے لیے صحیح راستوں کا تعین کریں۔ تاریخ گواہ ہے کہ علماے امت نے ان فرائض منصبی کو نہایت خوبی سے نبھایا ہے۔ یہ ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے۔ انھوں نے جنگلوں اور صحراؤں کی خاک چھانی ہے، گھر بار چھوڑے ہیں، نعمتوں سے صرف نظر کیا ہے، تازیانے کھائے ہیں، قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی ہیں اور بسااوقات اپنی جانیں بھی راہ حق میں پیش کر دی ہیں۔ بخاری و مسلم، مالک و احمد، بوحنیفہ و شافعی، غزالی و ابن تیمیہ نے دین و ملت کی جو خدمت کی ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہ اس طائفۂ علما کے سرخیل تھے۔ ان کے پیرووں نے عزم و استقامت اور حکمت و دانش کے ساتھ اقوام امت کی رہنمائی کی اور انھیں مدت تک جسد واحد میں پروئے رکھا۔ انھوں نے ارباب اقتدار کو ان کے فرائض سے منحرف نہیں ہونے دیا۔ عامۃ الناس کے اخلاق و کردار کو مجروح ہونے سے بچایا اور انھیں خوابوں میں جینے کے بجائے حقیقت پسندی کا درس دیا۔ اس رہنمائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان اخلاق و کردار، عدل و انصاف، علم و ہنر اور نظم و ترتیب میں اوج کمال پر فائز ہوئے اور اسی بنا پر صدیوں تک علم کی مسند اقتدار پر فائز رہے۔

امت جب زوال پزیر ہوئی تو جہاں وہ حکمران ہوئے جن کے عدل اجتماعی کو امتیں تسلیم کرتی تھیں، وہ سالار رخصت ہوئے جن کی ہیبت سے ظالم قومیں کانپ جاتی تھیں، وہ صناع رخصت ہوئے جنھوں نے اشہب تمدن کو مہمیز کر دیا تھا، وہ مدبر رخصت ہوئے جن کی دانش نے عمرانی علوم کے نئے دریچے کھول دیے تھے، وہ حکما رخصت ہوئے جن کے افکار نے

اسرار حیات کو آشکارا کر دیا تھا، وہاں وہ داعیان دین حق، وہ معلمین کتاب وسنت اور وہ قائدین ملت اسلامیہ بھی رخصت ہو گئے جوان سب کے لیے قوت محرکہ کا کردار ادا کر رہے تھے اور جن کے وجود سے ان سب کا وجود قائم تھا۔ یہ علما دنیا سے اٹھے اور اس طرح اٹھے کہ امت کا وجود روح اسلام سے خالی ہو گیا اور طاغوت کے تن مردہ میں پھر سے جان پڑ گئی:

جہاں سے اس طرح اٹھے یہ اہل مے خانہ
کہ بحر و بر میں عزازیل نے جلائے چراغ
فلک کا نوحہ زمیں کے حدود میں پہنچا
کہ کھو دیا ہے ستاروں نے منزلوں کا سراغ

جو لوگ ان کے جانشین ہوئے انھوں نے علم وتحقیق اور اخلاق وتقویٰ کا بہرہ تو وافر جمع کر لیا، مگر قومی واجتماعی امور میں امت کی صحیح رہنمائی کا فریضہ ادا کرنے سے قاصر رہے۔ اس ضمن میں انھوں نے امت کو جو درس دیا، واقعہ یہ ہے کہ وہ امت کی تعمیر وترقی کے بجائے شکست وریخت ہی کا باعث ہوا۔ اس موقع پر زمانہ ان سے یہ توقع کر رہا تھا کہ وہ وقت کی نبض پر ہاتھ رکھیں گے، حکمت ودانش کو بروئے کار لائیں گے، اسباب زوال کو متعین کر کے ان کے تدارک کی حکمت عملی ترتیب دیں گے اور پھر امت کو پوری ثابت قدمی کے ساتھ صحیح خطوط پر آگے بڑھائیں گے۔ مگر نہ زمانے کی نبض کو ٹٹولا گیا، نہ حکمت ودانش کو آزمایا گیا، نہ اسباب زوال کی تحقیق کی گئی اور نہ قومی ترقی کے لیے لائحۂ عمل مرتب کیا گیا۔ اس کے برعکس اس جماعت علما کی کارگزاری کی تفصیل یہ ہے کہ ان میں سے کچھ زوال کی نوحہ خوانی سے قوم پر مایوسی طاری کر کے خاموش ہو گئے، کچھ کنارہ کش ہو کر خانقاہوں میں کھو گئے، مگر بیشتر نے امت میں آتش جذبات کو انگیخت کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ یہی جذبات پرور علما اس دور زوال میں امت کی قیادت کے منصب پر فائز ہوئے اور آج تک یہ منصب انھی کے پاس ہے۔

گزشتہ دو تین صدیوں میں انھوں نے مسلمانوں کو جو رہنمائی فراہم کی ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ قرآن وسنت کی تعلیمات سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

انھوں نے مسلمانوں کو یہ پیغام دیا ہے کہ انھیں معاملات دنیا کو چشم خرد سے نہیں، بلکہ نگاہ جذبات سے دیکھنا چاہیے۔ ان پر اگر زوال آیا ہے تو اس کے اسباب ان کے اپنے ہاں جو ہیں سو ہیں، مگر اس کا بڑا سبب ان کے دشمنوں کی ریشہ دوانیاں ہیں۔ انھیں چاہیے کہ وہ دشمن اقوام کا قلع قمع کرنے کے لیے سر پر کفن باندھ کر اٹھ کھڑے ہوں اور اس وقت تک برسر پیکار رہیں، جب تک وہ ان کی سیاست تسلیم نہیں کر لیتیں یا صفحۂ ہستی سے محو نہیں ہو جاتیں۔ اس جدوجہد میں اگر وہ خود دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں تو انھیں جان رکھنا چاہیے کہ محکومی کی زندگی سے شہادت کی موت بدر جہا بہتر ہے۔

یہ طرز عمل سکھایا ہے کہ کمزور کو طاقت ور کے جواب میں حکمت سے نہیں، بلکہ شدید ردعمل سے کام لینا چاہیے۔ حکمت سراسر بزدلی کی علامت ہے۔ اگر وہ ظلم سہتے جائیں گے تو اس کا سلسلہ دراز ہوتا جائے گا۔

یہ تعلیم دی ہے کہ انھیں اسباب و وسائل کی فکر نہیں کرنی چاہیے، بلکہ اللہ کی نصرت پر بھروسا کر کے اپنے حقوق کے لیے برسر جنگ ہو جانا چاہیے۔ اگر ان کا ایمان سلامت ہے تو پروردگار عالم لازماً اپنے فرشتوں سے ان کی مدد فرمائیں گے۔ یہ کوئی نیا واقعہ نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ نے کئی مرتبہ پہلے بھی مختلف میدان ہائے کارزار میں ہزاروں اور لاکھوں کے مقابلے میں سینکڑوں مسلمانوں کو فتح عظیم سے ہم کنار کیا ہے۔

یہ سمجھایا ہے کہ ان کی بقا کا یہ ناگزیر تقاضا ہے کہ جہاں وہ مقیم ہوں، وہاں ان کے پاس لازماً سیاسی اقتدار ہونا چاہیے۔ وہ اقلیت میں ہوں تب بھی انھیں اس کے حصول کی جدوجہد کرنی چاہیے۔ اگر پرامن طریقے سے یہ جدوجہد بارآور نہ ہو سکے تو پر تشدد ہو کر اسے جاری رکھنا چاہیے۔

یہ باور کرایا ہے کہ دنیا پر حکمرانی نہ صرف ان کا استحقاق ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ فریضہ ہے۔ ہر مسلمان کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ اپنی استعداد کے لحاظ سے اس فرض کو بجا لائے۔ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر ایک مسلمان کا مقصد حیات ہی دنیا پر اسلام کی حکومت کا قیام ہونا چاہیے۔

یہ بتایا ہے کہ وہ خدا کے نزدیک دنیا کی سب سے مکرم قوم ہیں۔ اس لیے کہ وہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہیں اور ان کی زبان پر کلمۂ طیبہ جاری ہے۔ اس بنا پر آخرت میں تو انھیں سرخ رو ہونا ہی ہے، لیکن دنیا میں بھی وہ لائق فضیلت ہیں۔ چنانچہ اگر کسی وقت وہ اخلاقی اعتبار سے نہایت پست بھی ہو جائیں، تب بھی تعظیم و تکریم کے مستحق ہیں۔

یہ واضح کیا ہے کہ ان کی سیاست کی کلید جہاد و قتال ہے۔ جب تک وہ اس میدان میں سرگرم تھے تو وہ دنیا پر غالب تھے اور جب سے انھوں نے اس میدان کو چھوڑا ہے، محکومی ان کا مقدر بن گئی ہے۔ چنانچہ اگر وہ اپنی عظمت رفتہ کو واپس لانا چاہتے تو انھیں جہاد و قتال کے لیے مستعد ہونا ہوگا۔

اس تعلیم و تربیت کا خلاصہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک ہی درس ہے جو مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک کے علما کی زبانوں پر جاری ہے کہ مسلمانو، تلوار اٹھاؤ اور دنیا سے برسر پیکار ہو جاؤ، یہاں تک کہ دنیا کی مسند اقتدار پر قابض ہو جاؤ یا آخرت کے مرتبہ شہادت پر فائز ہو جاؤ۔

علما کی اس رہنمائی کو اگر تاریخ کے اوراق میں دیکھا جائے تو چند مثالیں بہت نمایاں ہیں۔

سید احمد شہید (۱۷۸۶۔۱۸۳۱) ہیں جنھوں نے ہند میں سکھوں کی حکومت کے خاتمے اور اسلامی حکومت کے قیام کے لیے تحریک شروع کی۔ جہاد کے نام پر چند سو سرفروشوں کو جمع کر کے سکھوں کی طاقت و رحکومت کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ابتدا میں کچھ علاقے پر قبضہ بھی کر لیا، مگر بالآخر بالاکوٹ کے مقام پر سکھوں کی بیس ہزار فوج سے مقابلے میں اپنے تمام سرفروش ساتھیوں سمیت شہید ہو گئے۔

امام شامل (۱۷۹۷۔۱۸۷۱) ہیں جن کی قیادت میں داغستان کے مسلمانوں نے روسی استعمار کے خلاف آزادی کی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

جنگ لڑی۔ یہ جنگ کم وبیش پچیس سال تک جاری رہی۔ جہاد اور آزادی کے نام پر ہزاروں مسلمانوں نے اپنی جانیں قربان کیں، مگر آخرکار ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

مہدی سوڈانی (۱۸۴۴ـ۱۸۸۵) ہیں جو سوڈان کو مصر سے آزاد کرا کے انگریزوں کے خلاف برسرپیکار ہو گئے۔ اسی دوران میں ۱۸۸۵ میں ان کی وفات ہو گئی۔ ان کے جانشین زیادہ عرصہ انگریزوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ ۱۸۹۹ میں انگریز سوڈان پر قابض ہو گئے۔ انگریز سالار نے جذبۂ انتقام کے تحت سفاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مہدی سوڈانی کی قبر اکھاڑ دی اور ان کی ہڈیاں تک جلا ڈالیں۔

مفتی اعظم امین الحسینی (۱۸۹۳ـ۱۹۷۴) ہیں جنھوں نے فلسطین کی آزادی کے لیے انگریزوں اور یہودیوں کے خلاف بھرپور جدوجہد کی۔ انگریزوں نے انھیں فلسطین سے جلاوطن کر دیا۔ انھوں نے آخری دم تک فلسطین کی آزادی کے لیے جدوجہد جاری رکھی جو بارآور نہ ہو سکی۔

حسن البنا (۱۹۰۶ـ۱۹۴۹) ہیں جنھوں نے مصر میں اسلامی حکومت کے قیام کی جدوجہد کے لیے ''اخوان المسلمون'' کے نام سے تنظیم قائم کی اور رضا کار بھرتی کیے۔ اخوان کے رضا کاروں نے فلسطین کی جنگ آزادی میں بھرپور حصہ لیا۔ برطانیہ کے دباؤ پر مصری حکومت نے ''اخوان المسلمون'' پر پابندی عائد کر دی، ہزاروں کارکنوں کو قید کر لیا۔ اسی ہنگامے میں حسن البنا کو شہید کر دیا گیا۔

سید قطب شہید (۱۹۰۶ـ۱۹۶۶) ہیں جو مصر میں ''اخوان المسلمون'' ہی کے بڑے رہنماؤں میں سے تھے۔ حکومت مخالف سرگرمیوں کی وجہ سے ۱۵ سال قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ اس دوران میں صدر جمال عبدالناصر نے انھیں وزارت تعلیم کی پیش کش کی، مگر سید قطب نے انکار کر دیا۔ ۱۹۶۶ میں انھیں حکومت کے خلاف بغاوت کے جرم میں پھانسی سے دی گئی۔

محمد بن عبدالکریم ریفی (۱۸۸۲ـ۱۹۶۳) ہیں جنھوں نے شمالی مراکش پر مسلط اسپین کی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ اسپین کی حکومت نے بغاوت فرو کرنے کے لیے انیس ہزار فوج بھیجی۔ عبدالکریم نے اسے زبردست شکست دے کر شمالی مراکش کو آزاد کرا لیا اور وہاں جمہوریہ ریف کے نام سے نئی حکومت قائم کی۔ اس سے فرانس کو خطرہ ہوا جو مراکش کے باقی حصے پر قابض تھا۔ اس نے اسپین سے مل کر تقریباً تین لاکھ افواج پر مشتمل لشکر تیار کیا اور بہت مختصر مدت میں ریاست ریف پر قبضہ کر کے عبدالکریم کو ۲۱ سال کے لیے قید کر دیا۔

ملا عمر ہیں جنھوں نے افغانستان کے حالیہ زمانۂ طوائف الملوکی میں طالبان کے ذریعے سے بزور حکومت حاصل کی۔ امریکی سپر پاور کے مطلوبہ افراد کو پناہ دے کر پورے دینی جذبے کے ساتھ امریکہ سے ٹکر لینے کا فیصلہ کیا۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں نکلا کہ وہ حکومت سے محروم ہوئے، ہزاروں صالح مسلمان جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے اور بموں کی تاخت سے افغانستان کھنڈر بن کر رہ گیا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

یہی وہ خطوط ہیں جن پر جمال الدین افغانی، ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر، علامہ اقبال، ابوالاعلیٰ مودودی، ابوالحسن علی ندوی، آیت اللہ خمینی، امیر شکیب ارسلان، مصطفے حسن سباعی، رشید رضا مصری اور ڈاکٹر حسن ترابی رحمھم اللہ جیسے جلیل القدر علما نے مسلمانوں کی تربیت کی۔ یہ سب لوگ دین کے علم بردار تھے، اسلام سے بے پناہ محبت رکھتے تھے، نیک نیت اور پاکیزہ صفت تھے اور دین وملت کے بعض دوسرے پہلووں میں لافانی خدمات کے کارگزار تھے، مگر اس سب کچھ کے باوجود قومی معاملات میں غلط رہنمائی کی وجہ سے امت کے وجود اجتماعی کے لیے ضرر رسانی کا باعث ہوئے۔

یہ رجال کار اگر جذباتی ہیجان اور مثالیت پسندی سے بالاتر رہتے اور حقیقت کی زمین پر کھڑے ہو کر امت کو درپیش مسائل کا جائزہ لیتے تو ان کا طرز عمل یقیناً مختلف ہوتا۔ کاش! وہ اس موقع پر مسلمانوں کو قوموں کے عروج وزوال کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے اس غیر متبدل قانون سے روشناس کراتے کہ:

''اللہ اس انعام کو جو کسی قوم پر کرتا ہے، اس وقت تک نہیں بدلتا، جب تک وہ اس چیز کو نہ بدل ڈالے جس کا تعلق خود اس سے ہے۔ بے شک اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔'' (الانفال ۸:۵۳)

''اللہ کسی قوم کے ساتھ اپنا معاملہ اس وقت تک نہیں بدلتا، جب تک وہ خود اپنی روش میں تبدیلی نہ کر لے۔ اور جب اللہ کسی قوم پر آفت لانے کا ارادہ کر لے تو وہ کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکتی اور ان کا اس کے مقابلے میں کوئی بھی مددگار نہیں بن سکتا۔'' (الرعد ۱۳:۱۱)

گویا قوموں کے عروج وزوال اور انعام وعقوبت کا فیصلہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ اس کا انعام قوم کے کردار اور صفات پر مبنی ہوتا ہے۔ جب تک کوئی قوم اللہ تعالیٰ کے مقررہ کردار کی حامل اور مطلوبہ صفات سے متصف رہتی ہے تو وہ انعامات کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں، بصورت دیگر وہ اس کے لیے زوال اور بربادی مقدر کر دیتے ہیں۔

_____ منظور الحسن

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ البقرۃ

(۵۵)

(گزشتہ سے پیوستہ)

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ، وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ، يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ. اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ. ﴿۲۵۷﴾

www.javedahmadghamidi.com

www.al-mawrid.org

(یہ ہدایت پانا چاہیں تو) اللہ ماننے والوں کا مددگار ہے۔ وہ اُنھیں اندھیروں سے روشنی کی طرف نکال لے جاتا ہے[۶۸۰]۔ (اِس کے برخلاف) نہ ماننے والوں کے مددگار اُن کے شیاطین ہیں، وہ اُنھیں روشنی سے اندھیروں کی طرف نکال لے جاتے ہیں۔ یہی دوزخ کے لوگ ہیں۔ یہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے[۶۸۱]۔ ۲۵۷

[۶۸۰] اصل الفاظ ہیں: 'يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ'۔ اِن میں 'النُّوْر' واحد اور 'الظُّلُمٰت' جمع استعمال ہوا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ جس نور کا یہاں ذکر ہے، اُس سے مراد علم و عقل اور ایمان و اخلاق کا نور ہے۔ اِس کے بارے میں بالبداہت واضح ہے کہ اِس کا منبع بھی ایک ہی ہے، یعنی پروردگار عالم اور اِس میں انتشار و اختلاف بھی نہیں ہوتا۔ اِس کے برخلاف علم و عقل اور ایمان و اخلاق سے محرومی کی ظلمتیں مختلف راستوں سے آتی ہیں اور اِن میں انتشار و اختلاف بھی لازماً ہوتا ہے۔

[۶۸۱] ہدایت و ضلالت کا جو قانون اِس آیت میں بیان ہوا ہے، اُس کی وضاحت استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس طرح فرمائی ہے:

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡ حَآجَّ اِبۡرٰھٖمَ فِیۡ رَبِّہٖۤ اَنۡ اٰتٰہُ اللّٰہُ الۡمُلۡکَ، اِذۡ قَالَ اِبۡرٰھٖمُ رَبِّیَ الَّذِیۡ یُحۡیٖ وَ یُمِیۡتُ . قَالَ: اَنَا اُحۡیٖ وَاُمِیۡتُ . قَالَ اِبۡرٰھٖمُ: فَاِنَّ اللّٰہَ

(اِس بات کو سمجھنا چاہتے ہو تو اِس کی مثالیں بہت ہیں)۔ کیا[۶۸۲] تم نے اُس شخص کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے اُس کے پروردگار کے معاملے میں محض اِس لیے حجت کرنا چاہی کہ اللہ نے اُسے اقتدار عطا فرمایا تھا؟[۶۸۳] اُس وقت جب ابراہیم نے (اُس سے) کہا کہ میرا پروردگار تو وہ ہے جو مارتا اور جلاتا ہے۔[۶۸۴] اُس

”... ہدایت وضلالت کے معاملے میں اصل اہمیت رکھنے والی شے یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کا دامن پکڑتا ہے یا کسی غیر کا۔ اگر خدا کا دامن پکڑتا ہے تو خدا اپنے بندے کا کارساز و مددگار بن جاتا ہے اور اپنی توفیق بخشی سے درجہ بہ درجہ اُسے نفس وشہوات کی تمام تاریکیوں اور کفر، شرک اور نفاق کی تمام ظلمات سے نکال کر ایمان کامل و توحید خالص کی شاہراہ پر لا کھڑا کرتا ہے۔ اور اگر بندہ اپنے رب سے منہ موڑ کر کسی اور راہ پر جانکلتا ہے تو پھر وہ شیطان اور اُس کی ذریات کے ہتھے چڑھ جاتا ہے اور وہ اُس کی نکیل اپنے ہاتھ میں لے کر عقل وفطرت کی ہر روشنی سے دور کر کے اُس کو ضلالت کے کھڈ میں گرا دیتے ہیں۔ مشہور مثل ہے: ”خانۂ خالی را دیومی گیرد“، جس گھر میں آدمی نہیں رہتا، وہ شیطان کا مسکن بن جاتا ہے۔ اِسی طرح جو دل ایمان سے خالی ہوتا ہے، وہ شیطان کا اڈا بن جاتا ہے، اور پھر شیاطین ایسے شخص کو گمراہی کی وادیوں میں سرگشتہ و حیران رکھتے ہیں۔“ (تدبر قرآن ۱/۵۹۸)

[۶۸۲] سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا یہ مناظرہ ”تالمود“ میں بھی نقل ہوا ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کے ہم عصر بادشاہ نمرود کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں اِس مناظرے کی وجہ غالباً یہ ہوئی کہ اُس زمانے کے بادشاہ اپنے آپ کو اوتار بادشاہ سمجھتے تھے۔ قدیم صحیفوں میں ذکر ہے کہ نمرود کی قوم جن دیوتاؤں کو پوجتی تھی، اُن میں سب سے بڑے دیوتا کا درجہ سورج کو حاصل تھا۔ نمرود کو بھی لازماً اِسی کا اوتار مانا جاتا رہا ہوگا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے دعوت توحید کے بعد یہ مناظرہ اِسی پس منظر میں ہوا ہے۔ نمرود نے کہا ہوگا کہ سورج دیوتا کے اوتار کی حیثیت سے تمھارا رب تو میں ہوں۔ مجھے چھوڑ کر یہ تم کس رب کو ماننے کی دعوت دے رہے ہو۔

[۶۸۳] اصل میں ’اَنۡ اٰتٰہُ اللّٰہُ الۡمُلۡکَ‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں ’اَنۡ‘ سے پہلے ’ب‘ عربی قاعدے کے مطابق حذف ہوگئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے جو اقتدار اُسے عطا فرمایا تھا، وہی اُس کے لیے فتنہ بن گیا اور اُس پر خدا کا شکر ادا کرنے کے بجائے اُس نے اپنے آپ کو خدا کے اوتار کی حیثیت سے پیش کرنا شروع کر دیا۔

[۶۸۴] اللہ تعالیٰ کی تعریف میں سب سے زیادہ واضح بات یہی ہو سکتی تھی جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمائی ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ آدمی کے دماغ میں خلل نہ ہو تو زندگی اور موت کے سوال پر ادنیٰ تامل بھی اُسے خدا کے ماننے پر مجبور کر دیتا

يَـاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ، فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ، فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ، وَاللّٰهُ لَا يَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ. ﴿۲۵۸﴾

نے جواب دیا کہ میں بھی مارتا اور جلاتا ہوں[۶۸۵]۔ ابراہیم نے فوراً کہا: اچھا تو یوں ہے کہ اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، تم ذرا اُسے مغرب سے نکال لاؤ[۶۸۶]۔ سو (یہ سن کر) وہ منکرِ حق بالکل حیران رہ گیا۔ اور (حقیقت یہ ہے کہ) اِس طرح کے ظالموں کو اللہ کبھی ہدایت نہیں دیتا[۶۸۷]۔ ۲۵۸

ہے۔

[۶۸۵] یعنی جس کا چاہوں، سر قلم کر دیتا ہوں اور جس کو چاہوں، بخش دیتا ہوں۔

[۶۸۶] نمرود کا معارضہ سراسر احمقانہ تھا، لیکن انبیا علیہم السلام چونکہ مناظر نہیں، بلکہ داعی ہوتے ہیں، اِس لیے سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اُس کو مزید کٹ حجتی کا موقع دینے کے بجاے اپنے پروردگار کی ایک ایسی صفت بیان کر دی جس میں وہ بحث کے لیے کوئی راہ نہیں پا سکتا تھا۔

استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس حجت ابراہیمی کے ایک دوسرے پہلو کی وضاحت میں لکھا ہے:

''... یہاں بلاغت کا یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ حضرت ابراہیم نے خاص طور پر سورج کی تسخیر کا ذکر فرمایا جس کو نمرود کی نظر میں معبود اعظم کی حیثیت حاصل تھی اور وہ اپنے آپ کو اِسی معبود اعظم کا مظہر بنائے ہوئے بیٹھا تھا۔ بہترین استدلال اور لطیف ترین طنز کی یہ ایک نہایت خوب صورت مثال ہے۔'' (تدبر قرآن ۱/ ۶۰۰)

[۶۸۷] یہ اُس مدعا کا بیان ہے جسے واضح کرنے کے لیے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا یہ واقعہ سنایا گیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... اِس میں ظالم کا لفظ خاص طور پر قابل غور ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں ظالم سے مراد وہ لوگ ہوتے ہیں جو اللہ کی نعمتوں اور اُس کی بخشی ہوئی قوتوں اور صلاحیتوں کو بے جا استعمال کرتے ہیں، جو اللہ کے انعامات کو اُس کا فضل قرار دینے کے بجاے اُن کو اپنا حق سمجھتے ہیں، جو نعمتوں پر خداے منعم کے شکر گزار ہونے کے بجاے غرور اور گھمنڈ میں مبتلا ہوتے اور ابلیس کی طرح اکڑتے ہیں، جو خدا کی بندگی اور فرماں برداری کی روش اختیار کرنے کے بجاے خود اپنی خدائی کے تخت بچھاتے اور اپنے کو رب ٹھیراتے ہیں۔ فرمایا کہ جو لوگ اِس ظلم میں مبتلا ہوتے ہیں، اُن پر ہدایت کی راہ نہیں کھلا کرتی۔ ایسے لوگوں کے سامنے حق کتنے ہی واضح طریقے پر آئے، وہ اُس کو قبول کرنے کے بجاے بحث اور کٹ حجتی کی کوئی نہ کوئی راہ ڈھونڈ ہی لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر اُن کو اِس کی کوئی راہ ملتی نظر نہیں آتی تو وہ نمرود کی طرح ہکے بکے اور ششدر ہو کر تو رہ جاتے ہیں، لیکن حق کو قبول پھر بھی نہیں کرتے۔'' (تدبر قرآن ۱/ ۶۰۰)

[باقی]

---

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

نماز فجر کا وقت

[اس روایت کی ترتیب وتدوین اور شرح ووضاحت جناب جاوید احمد غامدی کی رہنمائی میں ان کے رفقا معز امجد، منظور الحسن، محمد اسلم نجمی اور کوکب شہزاد نے کی ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

روى[1] انه كن نساء المؤمنات[2] يشهدن مع رسول الله صلى الله عليه وسلم[3] صلاة الفجر[4] متلفعات[5] بمروطهن ثم ينقلبن[6] الى بيوتهن حين يقضين الصلاة[7] لا يعرفهن احد[8] من الغلس[9].[10]

روایت ہے کہ مسلمان عورتیں چادریں اوڑھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز فجر ادا کرتی تھیں۔ پھر نماز ادا کر لینے کے بعد جب وہ گھروں کو لوٹتیں تو اندھیرے کی وجہ سے کوئی انھیں پہچان نہ پاتا۔

ترجمے کے حواشی

۱۔ معلوم ہوتا ہے کہ راوی اس بارے میں آگاہ کرنا چاہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز فجر کس وقت ادا فرمایا کرتے تھے۔ ان کے مشاہدے کے مطابق آپ صبح کی روشنی نمودار ہونے سے پہلے ہی نماز سے فارغ ہو جاتے تھے۔

متن کے حواشی

۱۔ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ بخاری کی روایت، رقم ۵۵۳ ہے۔ معمولی اختلاف کے ساتھ یہ حسب ذیل مقامات پر نقل ہوئی ہے:

بخاری، رقم ۳۶۵، ۸۲۹، ۸۳۴۔ موطا، رقم ۴۔ مسلم، رقم، ۶۴۵۔ ترمذی، رقم ۱۵۳۔ نسائی، رقم ۵۴۵، ۵۴۶، ۱۳۶۲۔ ابو داؤد، رقم ۴۲۳۔ ابن ماجہ، رقم ۶۶۹۔ دارمی، رقم ۱۲۱۶۔ احمد ابن حنبل، رقم ۲۴۰۹۷، ۲۴۱۴۲، ۲۵۴۹۳ ۲۶۱۵۳، ۲۶۲۶۵۔ ابن حبان، رقم ۱۴۹۸، ۱۴۹۹، ۱۵۰۰، ۱۵۰۱۔ ابن خزیمہ، رقم ۳۵۰۔ نسائی سنن الکبریٰ، رقم ۱۲۸۵، ۱۵۲۷، ۱۵۲۸۔ بیہقی، رقم ۱۹۷۲، ۱۹۷۳، ۱۹۷۴، ۱۹۷۵، ۳۰۸۵۔ ابویعلیٰ، رقم ۴۴۱۵، ۴۴۱۶، ۴۴۹۳۔ حمیدی، رقم ۱۷۴۔ ابن ابی شیبہ، رقم ۳۲۳۳، ۳۲۳۴۔ عبدالرزاق، رقم ۲۱۸۱۔

۲۔ روایات میں 'نساء المؤمنات' (مسلمان خواتین) کا ٹکڑا مختلف انداز سے روایت ہوا ہے۔ بعض روایات، مثلاً بخاری، رقم ۳۶۵ میں 'النساء من المؤمنات' (مسلمان خواتین میں سے بعض) کے الفاظ آئے ہیں۔ مسلم، رقم ۶۴۵ میں 'نساء من المؤمنات' (مسلمان خواتین میں سے کچھ خواتین) کے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔ بعض روایات مثلاً نسائی، رقم ۵۴۶ میں 'النساء' (خواتین) کا لفظ آیا ہے۔ دارمی، رقم ۱۲۱۶ کے الفاظ ہیں: 'نساء النبی' (نبی کی بیویاں)۔ بعض روایات مثلاً ابویعلیٰ، رقم ۴۴۱۵ میں یہ حصہ ان الفاظ میں نقل ہوا: 'نساء من نساء المؤمنات' (مومن خواتین میں سے کچھ خواتین)۔

۳۔ 'یشھدن مع رسول اللّٰہ' (وہ رسول اللہ کے ساتھ نماز میں شریک ہوتیں) کا جملہ روایتوں میں مختلف اسلوب میں نقل ہوا ہے۔ مسلم، رقم ۶۴۵ (ب) میں 'یصلین مع النبی' (وہ نبی کریم کے ساتھ نماز ادا کرتیں) کے الفاظ آئے ہیں۔ بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۳۶۵ میں 'فیشھد معہ النساء' (خواتین آپ کے ساتھ نماز میں شریک ہوتیں) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔ اسی طرح بخاری، رقم ۳۰۸۵ میں یہ بات بیان ہوئی ہے: 'فیشھدھا معہ النساء' (خواتین آپ کے ساتھ اسے ادا کرتیں)۔

۴۔ بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۳۶۵ میں 'صلاۃ الفجر' (نماز فجر) کے بجائے 'الفجر' (فجر) کا لفظ آیا ہے۔ بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۸۲۹ میں اس کے بجائے لفظ 'الصبح' (صبح) نقل ہوا ہے۔ ابن ماجہ، رقم ۶۶۹ میں 'صلاۃ الصبح' (صبح کی نماز) اور احمد ابن حنبل، رقم ۲۴۰۹۷ میں 'الغداۃ' (صبح) کے الفاظ آئے ہیں۔ اس کے برعکس ابویعلیٰ، رقم ۴۴۱۵ سے یہ تاثر ملتا ہے کہ یہاں کسی خاص نماز کا ذکر نہیں ہے، بلکہ یہ بات کسی بھی ایسی نماز سے متعلق ہے جو اندھیرے میں

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اداہوتی ہے۔

۵۔بعض روایات مثلاً ترمذی، رقم ۱۵۳میں لفظ 'متلفعات' (اوپر لپیٹنے) کا مترادف لفظ 'متلففات' نقل ہوا ہے۔

۶۔بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۳۶۵میں 'ثم ینقلبن' (پھر وہ لوٹتیں) کی جگہ 'ثم یرجعن' (پھر وہ لوٹتیں) کے الفاظ آئے ہیں۔بعض روایات میں ان سے مختلف الفاظ نقل ہوئے ہیں۔مثلاً بخاری، رقم ۸۲۹میں 'فینصرف النساء' (جب خواتین رخصت ہوتیں)، بخاری، رقم ۸۳۴میں 'فینصرفن' (جب وہ رخصت ہوتیں)،نسائی، رقم ۵۴۶میں 'فیرجعن' (جب وہ لوٹتیں)، احمد ابن حنبل، رقم ۲۴۰۹۷میں 'ثم یخرجن' (پھر وہ نکلتیں) اور ابن حبان کی روایت ۱۵۰۰میں 'ثم تخرج نساء المومنین' (پھر مومنین کی بیویاں نکلتیں) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

۷۔بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۸۲۹میں 'الی بیوتھن' (اپنے گھروں کی طرف) کے الفاظ نقل ہوئے، جبکہ بعض روایات مثلاً ابن ماجہ، رقم ۶۶۹میں ان کے بجائے 'الی بیوتھن' (اپنے گھر والوں کی طرف) کے الفاظ نقل ہوئے ہیں اور بیہقی، رقم ۱۹۷۳میں 'الی اھلیھن' (اپنے خاندانوں کی طرف) کے الفاظ آئے ہیں۔

نسائی، رقم ۱۳۶۲میں 'ثم ینقلبن الی بیوتھن حین یقضین الصلاۃ' (نماز ادا کرنے کے بعد وہ گھروں کو لوٹتیں) کے بجائے 'فکان اذا سلم انصرفن' (پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سلام پھیرتے اور وہ چلی جاتیں) کا جملہ نقل ہوا ہے۔

۸۔بخاری، رقم ۸۲۹میں 'لا یعرفن احد' (کوئی انھیں پہچان نہ پاتا) کی جگہ 'ما یعرفن' (وہ پہچانی نہ جاتیں) کے الفاظ آئے ہیں۔جبکہ بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۸۳۴میں 'لا یعرفن' (وہ پہچانی نہ سکتیں) کا جملہ اس اضافے کے ساتھ نقل ہوا ہے: 'لا یعرفن بعضھن بعضا' (وہ ایک دوسرے کو پہچان نہ پاتیں)۔ابن ماجہ، رقم ۱۲۱۶میں اس کے بجائے 'قبل ان یعرفن' (اس سے پہلے کہ وہ پہچان لی جاتیں) کا جملہ نقل ہوا ہے۔نسائی، رقم ۳۰۸۵میں یہ بات ان الفاظ کے ساتھ روایت ہوئی ہے: 'او ما یعرفھن احد من الناس' (لوگوں میں سے کوئی انھیں پہچان نہ پاتا)۔

۹۔'من الغلس' (اندھیرے کی وجہ سے) کے الفاظ بخاری، رقم ۳۶۵ سے لیے گئے ہیں۔بعض روایات مثلاً مسلم، رقم ۶۴۵میں یہی بات ان الفاظ میں آئی ہے: 'من تغلیس رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بالصلاۃ' (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندھیرے میں نماز ادا کرنے کی وجہ سے)۔

بعض روایات مثلاً ابن ماجہ، رقم ۶۶۹میں 'من الغلس' کے الفاظ اصل متن کی حیثیت سے نہیں، بلکہ بعد کے کسی راوی کی توضیح کے طور پر آئے ہیں۔

۱۰۔ابویعلیٰ، رقم ۴۴۹۳میں یہ روایت بالکل مختلف مفہوم میں نقل ہوئی ہے۔روایت درج ذیل ہے:

لـو رای رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم مـن انسـاء ما تری لمنعهن من المساجد کـمـا مـنـعـت بنو اسرائیل نساء ھا لقد رایتنا نصلی مع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسـلـم الـفجر فی مروطنا وننصرف وما یعرف بعضنا وجوہ بعض.

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر عورتوں کی وہ حالت دیکھتے جو ہم دیکھتے ہیں تو انھیں اسی طرح مسجدوں میں آنے سے روک دیتے جس طرح بنی اسرائیل نے اپنی عورتوں کو روک دیا تھا۔ ہمارا حال تو یہ تھا کہ اپنی چادریں اوڑھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز فجر ادا کرتیں اور نماز ادا کر کے اس طرح رخصت ہوتیں کہ ایک دوسرے کے چہروں کو پہچان نہ سکتی تھیں۔''

جاوید احمد غامدی

قانون عبادات

(۲)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

نماز کی تاریخ

نماز کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے، جتنی خود مذہب کی ہے۔ اِس کا تصور تمام مذاہب میں رہا ہے اور اِس کے مراسم اور اوقات بھی کم و بیش متعین رہے ہیں۔ ہندووں کے بھجن، پارسیوں کے زمزمے، عیسائیوں کی دعائیں اور یہودیوں کے مزامیر، سب اِسی کی یادگاریں ہیں۔ قرآن نے بتایا ہے کہ اللہ کے تمام پیغمبروں نے اِس کی تعلیم دی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت جس دین ابراہیمی کی تجدید کے لیے ہوئی، اُس میں بھی اِس کی حیثیت سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے اسمٰعیل کو ام القریٰ کی وادی غیر ذی زرع میں آباد کیا تو اِس کا مقصد یہ بتایا کہ 'ربنا لیقیموا الصلوٰة'[18] (پروردگار، تاکہ وہ نماز کا اہتمام کریں)۔ اِس موقع پر اُنھوں نے دعا فرمائی: 'رب اجعلنی مقیم الصلوٰة و من ذریتی'[19] (پروردگار، مجھے اور میری اولاد کو نماز کا اہتمام کرنے والا بنا دے)۔ سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ 'کان یامر اھله بالصلوٰة'[20] (وہ اپنے گھر والوں کو نماز کی تلقین کرتے تھے)۔ سیدنا شعیب کو اُن کی قوم نے طعنہ دیا کہ 'اصلوٰتك تامرك ان نترك ما یعبد آباؤنا'[21] (کیا تمھاری نماز تمھیں یہ سکھاتی ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کے معبودوں کو چھوڑ دیں)؟

۱۸؎ ابراہیم ۱۴: ۳۷۔

۱۹؎ ابراہیم ۱۴: ۴۰۔

۲۰؎ مریم ۱۹: ۵۵۔

سیدنا اسحٰق اور سیدنا یعقوب کی نسل کے پیغمبروں کے بارے میں قرآن کا بیان ہے: 'و اوحینا الیھم فعل الخیرات و اقام الصلوٰۃ'[22] (ہم نے اُن کو بھلائی کے کام کرنے اور نماز کا اہتمام کرنے کی وحی کی)۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا ہوئی تو حکم دیا گیا: 'و اقم الصلوٰۃ لذکری'[23] (میری یاد کے لیے نماز کا اہتمام رکھو)۔ زکریا علیہ السلام کی نسبت ارشاد ہوا ہے: 'وھو قائم یصلی فی المحراب'[24] (اور وہ محراب میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے)۔ سیدنا مسیح علیہ السلام نے اپنے متعلق فرمایا ہے: 'و اوصانی بالصلوٰۃ'[25] (اور اللہ نے مجھے نماز کا حکم دیا ہے)۔ لقمان عرب کے حکیم تھے، قرآن نے بتایا ہے کہ اُنھوں نے اپنے بیٹے کو نصیحت فرمائی: 'یا بنی اقم الصلوٰۃ'[26] (بیٹے، نماز کا اہتمام کرو)۔ بنی اسرائیل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا وعدہ تھا کہ 'انی معکم لئن اقمتم الصلوٰۃ'[27] (میں تمھارے ساتھ ہوں۔ اگر تم نماز پر قائم رہو گے)۔ قرآن کی گواہی ہے کہ زمانۂ رسالت میں یہود و نصاریٰ کے صالحین نماز کا اہتمام کرتے تھے:

مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ. (آل عمران ۳: ۱۱۳)

''اِن اہل کتاب میں سے ایک گروہ اللہ کے ساتھ اپنے عہد پر قائم ہے۔ یہ راتوں کو آیات الٰہی کی تلاوت کرتے اور اپنے پروردگار کے سامنے سجدہ ریز رہتے ہیں۔''

یہی بات اُس زمانے کے مشرکین عرب کے متعلق بھی بیان ہوئی ہے:

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ. (الماعون ۱۰۷: ۴-۵)

''اِس لیے بربادی ہے (حرم کے پروہت) اِن نمازیوں کے لیے جو اپنی نمازوں (کی حقیقت سے) غافل ہیں۔''

جاہلی شاعر جران العود کہتا ہے:

وادرکن اعجازًا من اللیل بعد ما اقام الصلوٰۃ العابد المتحنف

۲۱؎ ہود ۱۱: ۸۷۔

۲۲؎ الانبیاء ۲۱: ۷۳۔

۲۳؎ طٰہٰ ۲۰: ۱۴۔

۲۴؎ آل عمران ۳: ۳۹۔

۲۵؎ مریم ۱۹: ۳۱۔

۲۶؎ لقمان ۳۱: ۱۷۔

۲۷؎ مائدہ ۵: ۱۲۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

''اور اِن سواریوں نے رات کے پچھلے حصے کو پالیا، جبکہ عبادت گزار حنیفی نماز سے فارغ ہو چکا تھا۔''

اعشیٰ وائل کا شعر ہے:

وسبح علی حین العشیات والضحیٰ ولا تعبد الشیطان، واللّٰہ فاعبدا

''اور صبح وشام تسبیح کرو[28]، اور شیطان کی عبادت نہ کرو، بلکہ اللہ کی عبادت کرو۔''

روایتوں میں بھی یہود ونصاریٰ اور دین ابراہیمی کے پیرووں کی نماز کا ذکر ہوا ہے۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ سیدنا عمر نے یا غالباً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کسی کے پاس دو کپڑے ہوں تو دونوں میں نماز پڑھے اور اگر ایک ہی ہو تو تہ بند باندھ لے، اُسے نماز میں یہودیوں کی طرح چادر بنا کر لپیٹے نہیں[29]۔

سیدنا صدیق کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے جب کوئی نماز میں ہو تو یہودیوں کی طرح جھولے نہیں، بلکہ سکون کے ساتھ کھڑا ہو[30]۔

شداد بن اوس اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہودیوں کے برخلاف تم نماز میں جوتے اور موزے پہنے رہو[31]۔

ابو عبدالرحمٰن کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت میں اُس وقت تک کچھ خیر باقی رہے گا، جب تک وہ یہودیوں کی طرح مغرب کی نماز میں رات کے تاریک ہو جانے اور عیسائیوں کی طرح فجر کی نماز میں تاروں کے ڈوبنے کا انتظار نہ کریں گے[32]۔

ام المومنین سیدہ عائشہ فرماتی ہیں کہ رکوع میں گھٹنوں کے درمیان ہاتھ جوڑ لینا یہود کا طریقہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس سے منع فرمایا ہے[33]۔

ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات سے تین سال پہلے ہی میں نماز پڑھتا تھا۔ پوچھا گیا کہ کس کے لیے؟ فرمایا: اللہ کے لیے[34]۔

۲۸؎ قرینہ دلیل ہے کہ 'تسبیح' کا لفظ یہاں نماز کے لیے استعمال ہوا ہے۔ قرآن مجید میں بھی کئی مقامات پر یہ اِسی مفہوم میں آیا ہے۔

۲۹؎ ابوداؤد، رقم ۶۳۵۔

۳۰؎ کنزالعمال، رقم ۲۲۵۳۵۔

۳۱؎ ابوداؤد، رقم ۶۵۲۔

۳۲؎ احمد، رقم ۱۸۵۸۸۔

۳۳؎ فتح الباری، ابن حجر ۲/ ۲۷۴۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

یہود ونصاریٰ کی نماز کا ذکر بائیبل میں بھی جگہ جگہ ہوا ہے اور جس طرح قرآن نے بعض مقامات پر نماز کو اللہ کا نام لینے، قرآن پڑھنے، دعا کرنے، تسبیح کرنے اور رکوع و سجود کرنے سے تعبیر کیا ہے، اسی طرح بائیبل میں بھی نماز کو اِس کے ارکان سے تعبیر کیا گیا ہے۔

پیدایش میں ہے:

''اور وہاں سے کوچ کر کے (ابراہیم) اُس پہاڑ کی طرف گیا جو بیت ایل کے مشرق میں ہے اور اپنا ڈیرا ایسے لگایا کہ بیت ایل مغرب میں اور عی مشرق میں پڑا اور وہاں اُس نے خداوند کے لیے ایک قربان گاہ بنائی اور خدا کا نام لیا۔'' (۱۲:۸)

''تب ابراہیم سجدہ ریز ہو گیا اور خدا نے اُس سے ہم کلام ہو کر فرمایا۔'' (۱۷:۳)

''سو وہ مرد وہاں سے مڑے اور سدوم کی طرف چلے، پر ابراہیم خداوند کے حضور کھڑا ہی رہا۔'' (۱۸:۲۲)

''تب ابراہیم نے اپنے جوانوں سے کہا کہ تم یہیں گدھے کے پاس ٹھیرو۔ میں اور یہ لڑکا، دونوں ذرا وہاں تک جاتے ہیں اور سجدہ کر کے پھر تمھارے پاس لوٹ آئیں گے۔'' (۲۲:۵)

''اور (اسحٰق) نے وہاں قربان گاہ بنائی اور خدا کا نام لیا۔'' (۲۶:۲۵)

خروج میں ہے:

''تب لوگوں نے اُن کا یقین کیا اور یہ سن کر کہ خداوند نے بنی اسرائیل کی خبر لی اور اُن کے دکھوں پر نظر کی، اُنھوں نے اپنے سر جھکا کر سجدہ کیا۔'' (۴:۳۱)

زبور میں ہے:

''اے خداوند، تو صبح کو میری آواز سنے گا۔ میں سویرے ہی تیرے حضور میں نماز کے بعد انتظار کروں گا۔'' (۵:۳)

''لیکن میں تیری شفقت کی کثرت سے تیرے گھر میں آؤں گا۔ میں تیرا رعب مان کر تیری مقدس ہیکل کی طرف رخ کر کے سجدہ کروں گا۔'' (۵:۷)

''پر میں تو خداوند کو پکاروں گا اور خداوند مجھے بچا لے گا۔ صبح و شام اور دوپہر کو میں فریاد کروں گا اور نالہ کروں گا اور وہ میری آواز سن لے گا۔'' (۵۵:۱۶-۱۷)

''سمندر اُس کا ہے۔ اُسی نے اُس کو بنایا ہے اور اُسی کے ہاتھوں نے خشکی کو بھی تیار کیا۔ آؤ، ہم رکوع و سجود کریں اور اپنے خالق خداوند کے حضور گھٹنے ٹیکیں، کیونکہ وہ ہمارا خدا ہے۔'' (۹۵:۵-۶)

''میں تیری مقدس ہیکل کی طرف رخ کر کے سجدہ کروں گا اور تیری شفقت اور سچائی کی خاطر تیرے نام کا شکر کروں گا، کیونکہ تو نے اپنے کلام کو اپنے ہر نام سے زیادہ عظمت دی ہے۔'' (۱۳۸:۲)

سلاطین اول میں ہے:

---

۴۳ مسلم، رقم ۲۴۷۳۔

''جب تیری قوم اسرائیل تیرا گناہ کرنے کے باعث اپنے دشمنوں سے شکست کھائے اور پھر تیری طرف رجوع لائے اور تیرے نام کا اقرار کرکے اور اُس گھر کی طرف رخ کرکے نماز پڑھے اور تجھ سے مناجات کرے تو تو آسمان پر سے سن کر اپنی قوم بنی اسرائیل کا گناہ معاف کرنا اور اُن کو اُس ملک میں جو تو نے اِن کے باپ دادا کو دیا، پھر لے آنا۔'' (۸: ۳۳-۳۴)

یرمیاہ میں ہے:

''تو خداوند کے گھر کے پھاٹک پر کھڑا ہو اور وہاں اِس کلام کی منادی کرا دو کہ: اے یہوداہ کے سب لوگو جو خداوند کے حضور سجدہ ریز ہونے کے لیے اِن پھاٹکوں سے داخل ہوتے ہو، خداوند کا کلام سنو۔'' (۷: ۲)

دانیال میں ہے:

''جب دانیال کو معلوم ہوا کہ نوشتہ پر دستخط ہو گئے تو وہ اپنے گھر آیا اور اپنی کوٹھڑی کا دروازہ جو بیت المقدس کی طرف تھا، کھول کر اور دن میں تین مرتبہ گھٹنے ٹیک کر اپنے پروردگار کے حضور میں اُسی طرح نماز پڑھتا اور تسبیح و تحمید کرتا رہا، جس طرح پہلے کرتا تھا۔'' (۶: ۱۰)

''اور میں نے خداوند خدا کی طرف رخ کیا اور نماز اور دعاؤں کے ذریعے سے اور روزہ رکھ کر اور ٹاٹ اوڑھ کر اور راکھ پر بیٹھ کر اُس کا طالب ہوا۔'' (۹: ۳)

متی میں ہے:

''اور لوگوں کو رخصت کرکے (یسوع) تنہا نماز پڑھنے کے لیے پہاڑ پر چڑھ گیا اور جب شام ہوئی تو وہاں اکیلا تھا۔''

(۱۴: ۲۳)

''اُس وقت یسوع اُن کے ساتھ گتسمنی نام ایک جگہ میں آیا اور اپنے شاگردوں سے کہا: یہیں بیٹھے رہنا، جب تک کہ میں وہاں جا کر نماز پڑھ لوں۔'' (۲۶: ۳۶)

''پھر ذرا آگے بڑھا اور سجدہ ریز ہوا اور نماز پڑھتے ہوئے یوں دعا کی کہ اے میرے باپ، اگر ہو سکے تو یہ پیالہ مجھ سے ٹل جائے۔'' (۲۶: ۳۹)

مرقس میں ہے:

''اور وہ صبح سویرے اٹھ کر نکلا اور ایک ویران جگہ میں گیا اور وہ اُس جگہ نماز پڑھا کرتا تھا۔'' (۱: ۳۵)

لوقا میں ہے:

''اور اُن سے کہا: تم سوتے کیوں ہو، اٹھو اور نماز پڑھو تاکہ آزمایش میں نہ پڑو۔'' (۲۲: ۴۶)

اعمال میں ہے:

''پطرس اور یوحنا نماز کے وقت، یعنی دن کی نویں گھڑی میں[۳۵] ہیکل کو جا رہے تھے۔'' (۳: ۱)

۳۵۔ اِس سے مراد تیسرا پہر ہے، یعنی عصر کا وقت۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

''دوسرے دن جب وہ راہ میں تھے اور شہر کے نزدیک پہنچے تو پطرس ساتویں گھڑی[36] کے قریب کوٹھے پر نماز پڑھنے کو چڑھا۔'' (۱۰:۹)

''اور اُس پر غور کر کے اُس یوحنا کی ماں مریم کے گھر آیا جو مرقس کہلاتا ہے۔ وہاں بہت سے آدمی جمع ہو کر نماز پڑھ رہے تھے۔'' (۱۲:۱۲)

''اور سبت کے دن ہم شہر کے دروازے کے باہر ندی کے کنارے گئے، جہاں نماز کا معمول تھا اور بیٹھ کر اُن عورتوں سے جو اکٹھی ہوئی تھیں، کلام کرنے لگے۔'' (۱۶:۱۳)

''اور آدھی رات کے قریب پولس اور سیلاس نماز پڑھ رہے اور اللہ کی تسبیح کر رہے تھے اور قیدی (اُن کی یہ تسبیح و مناجات) سن رہے تھے۔'' (۱۶:۲۵)

''اُس نے یہ کہہ کر گھٹنے ٹیکے اور اُن سب کے ساتھ نماز پڑھی۔[37]'' (۲۰:۳۶)

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ نماز ہمیشہ سے پانچ وقت ہی ادا کی جاتی رہی ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ یہود کے ہاں اب تین نمازیں ہیں اور اوپر کے اقتباسات میں بھی ایک جگہ تین ہی نمازوں کا ذکر ہوا ہے، لیکن لوئی گنز برگ نے یروشلم کی تالمود پر اپنی تحقیقات میں واضح کیا ہے کہ یہود کے ہاں بھی یہ رواج بالکل اُسی طرح ہوا، جس طرح ہمارے ہاں اہل تشیع نے جمع بین الصلوٰتین کے طریقے پر ظہر اور عصر اور مغرب اور عشا کو اکٹھا کر کے پانچ نمازوں کو عملاً تین نمازوں میں تبدیل کر لیا ہے۔ اُس نے بتایا ہے کہ تالمود کے زمانے میں یہود دن میں پانچ وقت نماز کے لیے جمع ہوتے تھے: تین مرتبہ اُن نمازوں کے لیے جو اِس وقت بھی ادا کی جاتی ہیں اور دو مرتبہ 'شیما' کی تلاوت کے لیے۔ تاہم بعد میں بعض عملی دشواریوں کے پیش نظر صبح اور شام کی دو دو نمازوں کو جمع کر کے وہ صورت پیدا کر لی گئی جو اب رائج ہے۔[38]

نزول قرآن کے بعد اب سورۂ فاتحہ نماز کی دعا ہے۔ بائیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کے لیے اِس طرح کی دعا تمام الہامی کتابوں میں نازل کی گئی۔

تورات کی دعا یہ ہے:

''خداوند، خداوند، خداے رحیم اور مہربان، قہر کرنے میں دھیما اور شفقت اور وفا میں غنی۔ ہزاروں پر فضل کرنے والا۔ گناہ اور تقصیر اور خطا کار کا بخشنے والا، لیکن وہ مجرم کو ہرگز بری نہیں کرے گا، بلکہ باپ دادا کے گناہ کی سزا اُن کے بیٹوں اور پوتوں کو تیسری اور چوتھی پشت تک دیتا ہے۔[39]'' (خروج ۳۴:۶-۷)

---

۳۶ مراد ہے دوپہر، یعنی ظہر کا وقت۔

۳۷ بائیبل کے یہ تمام اقتباسات اُس کے عربی ترجمے کے مطابق ہیں جو براہ راست یونانی زبان سے ہوا ہے۔

۳۸ 'Judaism in Islam'، ابراہام کیٹش ۱۰۔

زبور کی دعا یہ ہے:

''اے خداوند، اپنا کان جھکا اور مجھے جواب دے، کیونکہ میں مسکین اور محتاج ہوں۔ میری جان کی حفاظت کر، کیونکہ میں دین دار ہوں۔ اے میرے خدا، اپنے بندے کو جس کا توکل تجھ پر ہے، بچا لے۔ یارب، مجھ پر رحم کر، کیونکہ میں دن بھر تجھ سے فریاد کرتا ہوں۔ یارب، اپنے بندے کی جان کو شاد کر دے، کیونکہ میں اپنی جان تیری طرف اٹھاتا ہوں۔ اِس لیے کہ تو یارب، نیک اور معاف کرنے کو تیار ہے اور اپنے سب دعا کرنے والوں پر شفقت میں غنی ہے۔

اے خداوند، میری دعا پر کان لگا اور میری منت کی آواز پر توجہ فرما۔ میں اپنی مصیبت کے دن تجھ سے دعا کروں گا، کیونکہ تو مجھے جواب دے گا۔ یارب، معبودوں میں تجھ سا کوئی نہیں اور تیری صنعتیں بے مثال ہیں۔ یارب، سب قومیں جن کو تو نے بنایا آ کر تیرے حضور سجدہ کریں گی اور تیرے نام کی تمجید کریں گی، کیونکہ تو بزرگ ہے اور عجیب وغریب کام کرتا ہے۔ تو ہی واحد خدا ہے۔

اے خداوند، مجھ کو اپنی راہ کی تعلیم دے۔ میں تیری راستی میں چلوں گا۔ میرے دل کو یک سوئی بخش تا کہ تیرے نام کا خوف مانوں۔ یارب، میرے خدا، میں پورے دل سے تیری تعریف کروں گا۔ میں ابد تک تیرے نام کی تمجید کروں گا، کیونکہ مجھ پر تیری بڑی شفقت ہے۔ اور تو نے میری جان کو پاتال کی تہ سے نکالا ہے۔

اے خدا، مغرور میرے خلاف اٹھے ہیں اور تندخو جماعت میری جان کے پیچھے پڑی ہے اور اُنھوں نے تجھے اپنے سامنے نہیں رکھا۔ لیکن تو یارب، رحیم وکریم خدا ہے۔ قہر کرنے میں دھیما اور شفقت وراستی میں غنی۔ میری طرف متوجہ ہو اور مجھ پر رحم کر۔ اپنے بندے کو اپنی قوت بخش اور اپنی لونڈی کے بیٹے کو بچا لے۔ مجھے بھلائی کا کوئی نشان دکھا تا کہ مجھ سے عداوت رکھنے والے اُسے دیکھ کر شرمندہ ہوں، کیونکہ تو نے اے خداوند، میری مدد کی اور مجھے تسلی دی ہے۔''

(۸۶:۱-۱۷)

انجیل کی دعا یہ ہے:

''اے ہمارے باپ، تو جو آسمان پر ہے، تیرا نام پاک مانا جائے۔ تیری بادشاہی آئے۔ تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے، زمین پر بھی ہو۔ ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے۔ اور جس طرح ہم نے اپنے قرض داروں کو معاف کیا ہے، تو بھی ہمارے قرض ہمیں معاف کر۔ اور ہمیں آزمایش میں نہ لا، بلکہ برائی سے بچا، کیونکہ بادشاہی اور قدرت اور جلال ہمیشہ تیرے ہی ہیں۔ آمین۔'' (متی ۶:۹-۱۳)

یہ نماز کی تاریخ ہے۔ اِس سے واضح ہے کہ قرآن نے جب لوگوں کو اِس کا حکم دیا تو یہ اُن کے لیے کوئی اجنبی چیز نہ تھی۔ وہ اِس کے آداب وشرائط اور اعمال واذکار سے پوری طرح واقف تھے۔ چنانچہ اِس بات کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ قرآن

۳۹؎ سیدنا ابراہیم کی ذریت کے لیے یہ اللہ تعالیٰ کے اُس خاص قانون کا حوالہ ہے جس کے تحت قومی حیثیت سے اُن کے جرائم کی سزا اُنھیں دنیا ہی میں دی جاتی رہی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اِس کی تفصیلات بیان کرتا۔ دین ابراہیمی کی ایک روایت کی حیثیت سے یہ جس طرح ادا کی جاتی تھی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے حکم پر بعض ترامیم کے ساتھ اِسے ہی اپنے ماننے والوں کے لیے جاری فرمایا اور نسلاً بعد نسلٍ، وہ اُسی طرح اِسے ادا کر رہے ہیں۔ چنانچہ اِس کا ماخذ اب مسلمانوں کا اجماع اور اُن کا عملی تواتر ہے۔ اِس کی تفصیلات ہم اِسی سے اخذ کر کے یہاں بیان کریں گے۔

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد عمار خان ناصر

مسجد اقصیٰ، یہود اور امت مسلمہ

(۲)

مسلمانوں کے حق تولیت کے 'شرعی دلائل' کا جائزہ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہم اوپر تفصیل کے ساتھ واضح کر چکے ہیں کہ مسجد اقصیٰ پر یہود کے حق تولیت کے منسوخ ہونے کا کوئی اشارہ تک قرآن وسنت اور کلاسیکل فقہی لٹریچر میں نہیں ملتا۔ یہ نقطہ نظر حال ہی میں مسلم اہل علم اور دانش وروں کے ہاں پیدا ہوا ہے اور چونکہ کسی شرعی دلیل کے بغیر یہود کی معزولی کے دعوے کی بے مائیگی ایسی واضح ہے کہ اس دعوے کے وکلا کو بھی اس کا پورا احساس ہے، لہٰذا اس خلا کی تلافی کے لیے انھوں نے کچھ دلیلیں بھی وضع کی ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان کا جائزہ بھی لے لیا جائے۔

۱۔ واقعہ اسرا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کے اہم واقعات میں سے ایک 'واقعہ اسرا' ہے۔ قرآن مجید کے مطابق انبیاے بنی اسرائیل کی عبادت گاہ اور ان کی دعوتی وتبلیغی سرگرمیوں کا مرکز ہونے کی حیثیت سے فلسطین کی مقدس سرزمین کی زیارت اور اس کے ماحول میں موجود روحانی نشانیوں سے فیض یاب ہونے کا موقع عنایت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے رات کے وقت معجزانہ طریقے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد اقصیٰ کا سفر کرایا۔ سورہ بنی اسرائیل میں ارشاد ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ. (اسراء ۱۷:۱)

''پاک ہے اللہ کی ذات جس نے اپنے بندے کو رات کے وقت مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کا سفر کرایا جس کے آس پاس ہم نے برکت دے رکھی ہے، تاکہ ہم اس کو اپنی کچھ نشانیاں دکھلائیں۔ بے شک وہ خوب سننے والے دیکھنے والا ہے۔''

روایات کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سفر میں یہاں نماز کی امامت بھی کرائی اور انبیاء کرام علیہم السلام نے آپ کی امامت میں نماز ادا کی۔[41]

اس واقعے کو بعض اہل علم نے یہود کے حق تولیت کی تنسیخ اور امت مسلمہ کے حق تولیت کے جواز کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ کے خیال میں اس کی نوعیت مستقبل میں ملنے والے حق تولیت کی 'بشارت' کی تھی۔ فرماتے ہیں:

''واقعہ معراج کی طرف اشارہ جس میں یہ حقیقت مضمر تھی کہ اب مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ دونوں گھروں کی امانت خائنوں اور بدعہدوں سے چھین کر نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ کی گئی۔ اب یہی ان مقدس گھروں اور ان کے انوار و برکات کے وارث اور محافظ و امین ہوں گے اور ان کے قابضین ـــــ مشرکین قریش اور یہود ـــــ عنقریب ان گھروں کی تولیت سے بے دخل کر دیے جائیں گے۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۱۴۷)

جبکہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ کی رائے میں اس کی نوعیت کسی آئندہ امر کی بشارت کی نہیں بلکہ فی الفور نافذ العمل حتمی فیصلے اور اعلان کی تھی، چنانچہ لکھتے ہیں:

''سب سے پہلے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس سورہ کے جلی عنوانات کیا ہیں:

(۱) یہ اعلان کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبی القبلتین (یعنی کعبہ اور بیت المقدس دونوں کے پیغمبر) ہیں۔

(۲) یہود جو اب تک بیت المقدس کے اصل وارث اور اس کے نگہبان و کلید بردار بنائے گئے تھے، ان کی تولیت اور نگہبانی کی مدت حسب وعدۂ الٰہی ختم کی جاتی ہے اور آل اسمٰعیل کو ہمیشہ کے لیے اس کی خدمت گزاری سپرد کی جاتی ہے۔'' (سیرت النبی ۳/ ۲۵۲)

''آپ کو دونوں قبلوں کی تولیت تفویض ہوئی اور نبی القبلتین کا منصب عطا ہوا۔ یہی وہ نکتہ تھا جس کے سبب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کعبہ اور بیت المقدس دونوں طرف رخ کرنے کا حکم دیا گیا اور اسی لیے معراج میں آپ کو مسجد حرام (کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) تک لے جایا گیا اور مسجد اقصیٰ میں تمام انبیا کی صف میں آپ کو امامت پر مامور کیا گیا تاکہ آج اس مقدس دربار میں اس کا اعلان عام ہو جائے کہ دونوں قبلوں کی تولیت سرکاری محمدی کو عطا ہوتی ہے اور نبی قبلتین نامزد ہوتے ہیں۔'' (ایضاً ص ۲۵۳)

اس استدلال کا ذرا گہری نظر سے جائزہ لیجیے:

دعوے کے ساتھ اس دلیل کے تعلق کی نوعیت تو یہ ہے کہ اگر ذہن میں کوئی مقدمہ پہلے سے قائم نہ کر لیا گیا ہو تو اس سے یہود کے حق تولیت کی منسوخی کا نکتہ اخذ کرنا فی الواقع کوئی آسان کام نہیں۔ قرآن مجید نے واقعہ اسرا کی غرض و غایت خود یہ بیان فرمائی ہے کہ اس سے مقصود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان روحانی نشانیوں سے فیض یاب ہونے کا موقع دینا تھا جو انبیاء کی اس مقدس اور بابرکت سرزمین میں اور بالخصوص مسجد اقصیٰ کے اندر اور اس کے اردگرد جا بجا بکھری ہوئی ہیں۔ یہ اس سفر کی

۴۱؎ تفسیر ابن کثیر ۳/ ۳۴۔ البدایہ والنہایہ ۳/ ۱۰۹، ۱۱۱۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

بنیادی غرض و غایت تھی جبکہ دیگر جزوی اسرار اور حکمتوں پر ان چودہ صدیوں میں اہل علم مختلف زاویوں سے روشنی ڈالتے رہے ہیں لیکن اس تمام لٹریچر میں اس بات کی طرف کہیں کوئی اشارہ نہیں ہے کہ اس کا مقصد یہود کو مسجد اقصیٰ کی تولیت کے حق سے معزول کرنا اور اس حق کو مسلمانوں کی طرف منتقل کر دینا تھا۔ یہ راز ہمارے علما نے حال ہی میں دریافت کیا ہے۔

اس ضمن میں مولانا اصلاحی رحمہ اللہ کے جواب میں تو ہمیں یہی عرض کرنا ہے کہ اگر واقعہ اسرا کی نوعیت اس ضمن میں ایک اشارے کی ہے تو ظاہر ہے کہ یہ اشارہ، مسجد حرام کی تولیت کے بارے میں وارد ابتدائی اشارے کی طرح، اس بات کا مقتضی تھا کہ بعد میں مناسب موقع پر اس کو واضح حکم کی شکل بھی دے دی جاتی۔ آخر کیا وجہ ہے کہ نہ قرآن مجید سورۂ براءۃ میں ایک مناسب موقع پیدا ہونے کے باوجود اس کی تصریح کرتا ہے، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس ضمن میں کوئی واضح ہدایت دیتے ہیں، نہ سیدنا عمر فتح بیت المقدس کے موقع پر اس بات کی وضاحت کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور نہ بعد کے فقہا کے ہاں اس بات کا کوئی ذکر ملتا ہے کہ یہود کا اپنے قبلے پر اب کوئی حق باقی نہیں رہا؟

باقی رہے وہ اہل علم جو اس واقعہ کو ایک حتمی اعلان کی حیثیت دیتے ہیں، تو ہماری ان سے گزارش ہے کہ وہ ازراہ کرم حسب ذیل سوالات کا جواب عنایت فرمائیں:

۱۔ اس میں کیا حکمت ہے کہ مشرکین کے حق تولیت کی تنسیخ کا تو قرآن مجید میں ڈنکے کی چوٹ اعلان کیا گیا اور اس کے بعد ۹ ہجری میں حج کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی عام منادی کا اہتمام کیا لیکن مسجد اقصیٰ پر یہود کے حق تولیت کی تنسیخ واقعہ اسرا میں یوں پنہاں کر دی گئی کہ زمانہ حال سے قبل تیرہ صدیوں تک کسی کے لیے اس کو دریافت کرنا ممکن ہی نہ ہوا؟

۲۔ مشرکین کی معزولیت کا فیصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ۲۳ سالہ نبوی زندگی کے بالکل آخری زمانے میں اس وقت کیا گیا جب کہ مشرکین پر دعوت و تبلیغ کے میدان میں اتمام حجت کرنے کے بعد فتح مکہ کی صورت میں سیاسی لحاظ سے بھی ان کو مغلوب کیا جا چکا تھا۔ اس کے برخلاف اہل کتاب کے ساتھ مباحثہ کا آغاز مکی زندگی کے آخری سالوں میں ہوا جو مدنی زندگی میں اپنے عروج کو پہنچا۔ ان کی سیاسی طاقت کو توڑ کر ان کو مغلوب کر لینے کا حکم قرآن مجید میں بالکل آخری زمانے میں سورۂ براءۃ میں دیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ تبوک میں اس سمت میں جدوجہد کا آغاز بھی کر دیا لیکن اس حکم کی عملی تکمیل خلفائے راشدین کے عہد میں ہوئی۔ آخر اس کی کیا توجیہ کی جائے کہ مشرکین کی معزولی کا فیصلہ تو ان پر اتمام حجت اور سیاسی غلبہ حاصل ہو جانے کے بعد کیا گیا لیکن بیت المقدس کے حق تولیت سے یہود کی معزولی کا فیصلہ مکہ ہی میں اس وقت کر دیا گیا جبکہ، اتمام حجت اور سیاسی غلبہ تو درکنار، ابھی ان کے ساتھ باقاعدہ مباحثہ کا بھی آغاز نہیں ہوا تھا؟

۳۔ اس الجھن کا کیا حل پیش کیا جائے گا کہ مسجد اقصیٰ بہرحال اسلام میں ''تیسرے'' مقدس مقام کی حیثیت رکھتی ہے، اس کے لیے مسجد حرام اور مسجد نبوی جیسی حرمت و تقدس کے احکام بھی شریعت میں ثابت نہیں اور نہ مسلمانوں کی حج اور قربانی

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.com

جیسی عبادات کے حوالے سے اسے کوئی خصوصی اہمیت حاصل ہے، تو پھر آخر کس معقول وجہ سے مسجد حرام کا معاملہ موخر کر کے مسجد اقصیٰ کی تولیت کا فیصلہ اس سے کہیں پہلے کر دینے کا اہتمام کیا گیا؟

۴۔ اگر حق تولیت کی تنسیخ کا فیصلہ واقعہ اسرا ہی کے موقع پر ہو چکا تھا تو ہجرت مدینہ کے بعد تحویل قبلہ کے حکم کی کیا حکمت اور معنویت باقی رہ جاتی ہے؟ اس حکم کی حکمت، جیسا کہ ہم آئندہ سطور میں واضح کریں گے، یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے پیروکاروں اور اور کمزور مدعین ایمان کے مابین امتیاز قائم ہو جائے اور یہود اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ مانوس ہو جائیں۔ واقعہ اسرا کی اس تعبیر کے مطابق اگر مسجد اقصیٰ پر یہود کے حق کی صاف نفی کی جا چکی تھی تو تحویل قبلہ سے آزمائش اور تالیف قلب کے مذکورہ مقاصد آخر کس بنیاد پر حاصل کرنا مقصود تھے؟

۵۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ واقعہ اسرا سے اس استدلال کی جڑ قرآن مجید نے سورہ بنی اسرائیل کی انھی آیات میں خود کاٹ دی ہے۔ واقعہ اسرا کے ذکر کے بعد قرآن مجید نے اسی سلسلہ بیان میں مسجد اقصیٰ کی بربادی اور اس میں سے یہود کی بے دخلی کے دو تاریخی واقعات کا ذکر کیا ہے اور اس کے بعد فرمایا ہے:

عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یَّرْحَمَکُمْ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا. (اسراء ۱۷:۸)

”توقع ہے کہ تمھارا رب تم پر پھر رحمت کرے گا۔ اور اگر تم نے دوبارہ سرکشی اور فساد کا رویہ اختیار کیا تو ہم بھی اس عذاب کا مزہ تمھیں دوبارہ چکھا دیں گے۔“

یعنی قرآن مجید واقعہ اسرا کے بعد بھی اس بات کا امکان تسلیم کرتا ہے کہ اللہ کی رحمت سے یہود کو دوبارہ اپنے مرکز عبادت کی بازیابی اور اس میں سلسلہ عبادت کے احیا کا موقع ملے، اگرچہ یہ موقع بھی پہلے مواقع کی طرح اطاعت اور حسن کردار کے ساتھ مشروط ہوگا۔

ان دلائل سے واضح ہے کہ ہمارے اہل علم کی ایجاد کردہ واقعہ اسرا کی یہ تازہ تعبیر علمی لحاظ سے بالکل بے بنیاد ہے۔

۲۔ تحویل قبلہ

یہود کے حق تولیت کی تنسیخ کے ضمن میں دوسرا استدلال تحویل قبلہ کے واقعے سے کیا جاتا ہے۔ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے کے بعد یہود کی تالیف قلب اور مسلمانوں کے ایمان کو جانچنے کے لیے کچھ عرصہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے مسجد حرام کے بجائے مسجد اقصیٰ کو، جو یہود کا قبلہ تھی، مسلمانوں کا قبلہ مقرر فرمایا تھا اور تقریباً سترہ ماہ تک مسلمان اس کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے رہے۔ بعد میں اس حکم کو منسوخ کر کے انھیں دوبارہ مسجد حرام کی طرف رخ کرنے کی ہدایت کی گئی۔ اس واقعہ کا تذکرہ سورۂ بقرہ کی آیات ۱۴۲ تا ۱۴۵ میں کیا گیا ہے۔

سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ اس واقعہ کو یہود کے حق تولیت کی معزولی کا حکم نامہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

”بیت المقدس اسلام کا دوسرا قبلہ ہے اور اس کی تولیت امت محمدیہ کا حق تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو اس

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تولیت کی بشارت دے دی تھی اور فرما دیا تھا کہ میری موت کے بعد یہ واقعہ پیش آئے گا۔'' (سیرت النبی، ۳/۳۸۵)

اس ضمن میں خود قرآن مجید کی تصریحات سے تین باتیں صاف واضح ہیں:

ایک یہ کہ مسجد اقصیٰ کو قبلہ مقرر کرنے کے حکم کا مقصد یہ تھا کہ اہل ایمان کی آزمائش کی جائے اور مضبوط اہل ایمان اور کمزور اہل ایمان کے مابین امتیاز قائم کر دیا جائے:

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ. (البقرہ ۲: ۱۴۳)

''اور ہم نے یہ قبلہ جس کی طرف آپ رخ کرتے رہے، صرف اس لیے مقرر کیا تا کہ ہم رسول کی پیروی کرنے والوں اور الٹے پاؤں پلٹ جانے والوں کے مابین امتیاز قائم کر دیں۔''

دوسری یہ کہ مسجد اقصیٰ کی طرف رخ کرنے کا یہ حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو طبعاً پسند نہیں تھا اور آپ کی یہ خواہش تھی کہ دوبارہ مسجد حرام کو مسلمانوں کا قبلہ بنا دیا جائے:

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِى السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا. (البقرہ ۲: ۱۴۴)

''آپ کے چہرے کے بار بار آسمان کی طرف اٹھنے کو ہم دیکھتے رہے ہیں سو ہم آپ کو اس قبلے کی طرف پھیر دیں گے جو آپ کو پسند ہے۔''

تیسری یہ کہ اس حکم کے منسوخ ہونے پر یہود ناخوش تھے اور ان کی خواہش تھی کہ مسلمان انھی کے قبلے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی اس خواہش کو مسترد کر دیا:

وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآئَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ. (البقرہ ۲: ۱۴۵)

''نہ آپ ان کے قبلے کی طرف رخ کریں گے اور وہ آپس میں ایک دوسرے کے قبلے کی طرف۔ اور اگر واضح حکم آ جانے کے بعد آپ ان کی خواہشات کے پیچھے چلے تو آپ کا شمار ظالموں میں ہوگا۔''

اس کے ساتھ اہل علم کی بیان کردہ یہ حکمت بھی پیش نظر رکھیں کہ مسجد اقصیٰ کو قبلہ مقرر کرنے سے یہود مدینہ کی تالیف قلب یعنی انھیں مسلمانوں کے ساتھ مانوس اور اسلام کی طرف مائل کرنا مقصود تھا۔[۴۲]

اب ذرا غور فرمائیے کہ ان میں سے کون سی بات ہے جو حق تولیت کی تنسیخ کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے؟

اگر مسجد اقصیٰ کو مسلمانوں کا قبلہ مقرر کرنے کا مقصد یہود کے حق تولیت کو منسوخ کرنا تھا تو واقعہ کی یہ حکمت اہمیت کے لحاظ سے قرآن کی بیان کردہ حکمت سے کہیں بڑھ کر ہے۔ کیا وجہ ہے کہ قرآن اس اہم تر حکمت سے یہاں صرف نظر کر جاتا ہے؟

---

۴۲ رازی، مفاتیح الغیب، ۴/۱۱۵۔ ابن العربی، احکام القرآن، ۱/۶۰۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

پھر مفسرین نے اس کی جو دوسری حکمت یعنی یہود کی تالیف قلب سمجھی ہے، وہ حق تولیت کی منسوخی کے بالکل معارض ہے۔ اگر مسلمانوں کو یہود کے قبلے کی طرف رخ کرنے کا حکم دینے کا مقصد یہود کے قلوب کو اسلام اور مسلمانوں کے لیے نرم کرنا تھا تو ظاہر ہے کہ پھر اس حکم کا مقصد ان کے حق تولیت کی تنسیخ نہیں ہو سکتا۔ حق تولیت کی تنسیخ کے دعوے کے ساتھ ان کے قبلے کی طرف رخ کرنا آخر تالیف قلب کا کون سا طریقہ ہے؟

پھر اگر مسجد اقصیٰ کے استقبال کا مطلب مسلمانوں کے نزدیک یہ تھا کہ اس مرکز پر اب یہود کا کوئی حق باقی نہیں رہا تو اس حکم کے منسوخ ہونے پر یہود کو خوش ہونا چاہیے تھا یا ناخوش؟ کیا وہ اس لیے مسلمانوں کی طرف سے مسجد اقصیٰ کو قبلہ بنائے جانے کے خواہش مند تھے کہ اس طریقے سے مسلمان ان کے قبلے پر حق جمائے رکھیں اور زبان حال سے ان کے سینوں میں نشتر چبھوتے رہیں؟

پھر قرآن مجید جس طرح قبلتك کے الفاظ سے مسجد حرام کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبی تعلق کو واضح کرتا ہے، اسی طرح کسی منفی تبصرے کے بغیر قبلتھم کے الفاظ سے مسجد اقصیٰ کے ساتھ یہود کی قلبی وابستگی کی کیفیت کو بھی بیان کرتا ہے۔ حق تولیت کی منسوخی کے معرض بیان میں اس اسلوب کی ناموزونیت کسی صاحب ذوق سے مخفی نہیں۔

علاوہ ازیں مدنی زندگی کے عین آغاز میں، جبکہ ریاست مدینہ کے استحکام کے لیے یہود کے داخلی تعاون کی اہمیت سیاسی لحاظ سے ناقابل انکار تھی، ایک ایسا اعلان کرنے میں کیا حکمت تھی جس کی اس وقت نہ عملاً کوئی اہمیت تھی اور نہ اس کے روبہ عمل لائے جانے کا کوئی فوری امکان؟ یہود جیسی کینہ پرور قوم کے ساتھ ایک سنگین نوعیت کی مذہبی بحث چھیڑ دینے کا اس نازک موقع پر آخر کیا فائدہ تھا؟

واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا اسے 'یہود کا قبلہ' تسلیم کرتے ہوئے شراکت کے اصول پر رخ تھا نہ کہ تنسیخ کے اصول پر۔ اپنے پس منظر، جزئیات اور قرآن کے اسلوب بیان کے لحاظ سے یہ واقعہ اس سے ابا کرتا ہے کہ اس سے یہود کے حق تولیت کی منسوخی کا حکم تو درکنار، کوئی اشارہ بھی استنباط کیا جائے۔ ہم، فی الواقع نہیں سمجھ سکے کہ اس پس منظر کے ساتھ مسجد اقصیٰ کو عارضی طور پر مسلمانوں کا قبلہ مقرر کرنے کے اس حکم کو دلالت کی کون سی قسم کے تحت مستقل تولیت کا پروانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

واقعہ اسرا اور تحویل قبلہ کے واقعات سے استدلال کے مذکورہ انداز اصلاً علمی نوعیت کے ہیں اور ان کی کم مائیگی بالکل واضح ہے۔ ان کے علاوہ ایک اور انداز استدلال بھی موجود ہے جسے صحافتی، سیاسی یا جذباتی میں سے کوئی بھی عنوان دیا جا سکتا ہے اور جسے میڈیا میں اور عالمی فورموں پر اس وقت مسلمانوں کے بنیادی استدلال کی حیثیت حاصل ہے۔ اس طریق استدلال میں یہود کے حق تولیت کے برقرار رہنے یا منسوخ ہو جانے کا سوال ہی سرے سے گول کر کے بات کا آغاز یہاں سے کیا جاتا ہے کہ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر معراج کے موقع پر مسجد اقصیٰ میں تشریف لائے تھے اور مسلمانوں نے

ایک مخصوص عرصے تک اس کی طرف رخ کر کے نمازیں ادا کی تھیں، اس لیے اس مسجد پر مسلمانوں ہی کا حق ہے اور دوسرا کوئی اس میں شرکت کا دعوے دار نہیں ہو سکتا۔

اس سلسلے میں ہماری گزارش یہ ہے کہ واقعہ اسرا اور تحویل قبلہ کے واقعات یقیناً مسجد اقصیٰ کے ساتھ مسلمانوں کی اعتقادی اور مذہبی وابستگی کے اسباب میں سے اہم سبب ہیں لیکن ان کی یہ تعبیر کہ اب اس مقام پر صرف اور صرف مسلمان حق رکھتے ہیں اور یہود کے تمام اعتقادات اور جذبات کی کوئی وقعت نہیں رہی، عقلی اور اخلاقی دونوں لحاظ سے ایک نہایت بودا موقف ہے۔

۱۹۳۰ء میں برطانوی شاہی کمیشن نے دیوار گریہ کے حوالے سے مسلم موقف پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا:

> ''کمیشن مسلم فریق کا یہ موقف قبول کرنے کے لیے تیار ہے کہ چونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم براق پر سوار ہو کر یہاں آئے تھے، اس لیے پوری مغربی دیوار مسلمانوں کے لیے مقدس ہے لیکن کمیشن کی رائے میں اس بات سے اس حقیقت کی نفی نہیں ہو جاتی کہ یہودیوں کے لیے بھی اس دیوار کا تقدس برقرار رہے۔ اگر پیغمبر کی تشریف آوری کی قابل احترام یاد (یہ الگ بات ہے کہ ان کے براق کو یہودیوں کے گریہ وزاری کے مقام سے ایک مخصوص فاصلے پر باندھا گیا تھا) پوری کی پوری مغربی دیوار کو مسلمانوں کے لیے مقدس بنا سکتی ہے تو اسی اصول پر اس تعظیم کو بھی احترام کی نظر سے کیوں نہ دیکھا جائے جس کا اظہار اس سے بھی کئی صدیاں پہلے سے یہودی اس دیوار کے متعلق کرتے چلے آ رہے ہیں جو ان کے اعتقاد کے مطابق اس قدیم ہیکل کی واحد باقی ماندہ یادگار ہے جس کے بارے میں ان کا عقیدہ ہے کہ وہ خدا کی موجودگی سے معمور ہے؟''

یہ تبصرہ واقعہ اسرا اور قبلہ ثانی کی مذکورہ تعبیر پر بھی بعینہٖ صادق آتا ہے۔ اگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مسجد اقصیٰ میں تشریف لانے اور مسلمانوں کے کچھ عرصہ تک اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے سے مسلمان اس کی تولیت کے حق دار بن سکتے ہیں تو آخر یہود اس بنیاد پر کیوں یہ حق نہیں رکھتے کہ اس مقام کو تین ہزار سال سے ان کے قبلے کی حیثیت حاصل ہے، اس کا حج ان کے مذہبی فرائض کا حصہ ہے، اور ان کے سینکڑوں انبیا اور کاہن صدیوں تک اس میں تعلیم وتبلیغ کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں؟

۳۔ فتح بیت المقدس کی بشارت

سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ کے مذکورہ اقتباس میں فتح بیت المقدس کی بشارت نبوی کو بھی اس ضمن میں دلیل کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ خلط مبحث کی ایک افسوس ناک مثال ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو جس چیز کی بشارت دی، وہ یہ تھی کہ اہل کتاب کے سیاسی طور پر مغلوب ہونے کے نتیجے میں بیت المقدس کا شہر بھی مفتوح ہو کر مسلمانوں کے قبضے میں آ جائے گا۔ اس کا مسجد اقصیٰ کی تولیت کے معاملے سے آخر کیا تعلق ہے؟

اگر اس فقہی ضابطے کا حوالہ دیا جائے کہ کسی شہر کے مفتوح ہونے کی صورت میں وہاں کی عبادت گاہوں پر تولیت کا حق بھی مفتوحین سے چھن جاتا ہے تو ہم عرض کریں گے کہ فقہا کی تصریحات کے مطابق یہ ضابطہ بزور قوت مفتوح ہونے والے

علاقوں کے لیے ہے، جبکہ بیت المقدس صلحاً مفتوح ہوا تھا۔ نیز اگر بیت المقدس پر اس ضابطہ کا اطلاق کیا جائے تو ظاہر ہے کہ وہاں کی ساری عبادت گاہوں کو اس کے دائرے میں آنا چاہیے تو پھر سیدنا عمرؓ نے معاہدۂ بیت المقدس میں یہاں کی عبادت گاہوں پر اہل مذہب کے تولیت وتصرف کے حق کو کس اصول کے تحت تسلیم کیا؟ اور اگر بیت المقدس کے مفتوح ہونے کے بعد اہل کتاب کی دیگر عبادت گاہوں پر ان کا حق تولیت باقی رہ سکتا ہے تو مسجد اقصیٰ پر، جو کہ ان کا قبلہ بھی ہے، کیوں نہیں رہ سکتا؟ اگر یہ کہا جائے کہ مسجد اقصیٰ کا معاملہ دیگر عبادت گاہوں سے مختلف ہے تو سوال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت میں اس کا کہاں ذکر ہے اور اس تفریق کی شرعی بنیاد کیا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ سیاسی طور پر مغلوب ہونا ایک الگ بات ہے اور عبادت گاہ کے حق تولیت سے معزول ہونا ایک بالکل دوسری بات۔ دونوں کو کسی بھی طرح سے مترادف قرار نہیں دیا جا سکتا۔

۴۔ اہل کتاب کے ہاں پیش گوئیاں

مولانا قاری محمد طیب نے اس سلسلے میں نصاریٰ کی کتابوں میں موجود چند مزعومہ پیش گوئیوں کو بھی دلیل میں پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''اسلام سے پہلے کے نصاریٰ بھی بیت المقدس کو اسلام کا حق سمجھے ہوئے تھے۔... کتب مقدسہ کی اس خبر کے مطابق جب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ فتح بیت المقدس کے لیے شام پہنچے تو انھیں دیکھ کر اس کے نصرانی متولیوں نے ان تمام علامات کی تصدیق کی جو کتاب مقدس میں وہ حضرت عمرؓ کے بارے میں پڑھ چکے تھے اور بلا لڑے بھڑے بیت المقدس ان کے حوالے کر دیا جو بیت المقدس کے حق اسلام ہونے کی نمایاں شہادت ہے۔''

(مقامات مقدسہ اور اسلام کا اجتماعی نظام، ۶۵۰)

اگر ''بیت المقدس'' سے مولانا علیہ الرحمۃ کی مراد یروشلم کا شہر ہے تو وہ ہماری بحث کے دائرے سے خارج ہے، البتہ اگر شہر کی تولیت کے ضمن میں مسجد اقصیٰ کی تولیت کا حق بھی داخل سمجھا جا رہا ہے تو گزشتہ سطور میں کی گئی بحث کی روشنی میں یہ بات درست نہیں۔

اور اگر ''بیت المقدس'' سے ان کی مراد براہ راست مسجد اقصیٰ ہے تو ان کا یہ استدلال نہ تحقیقی لحاظ سے کوئی وزن رکھتا ہے اور نہ الزامی لحاظ سے۔ الزامی لحاظ سے اس لیے کہ الزام کی بنیاد ظاہر ہے کہ ایسے مآخذ پر ہونی چاہیے جنھیں خود اہل کتاب کے نزدیک استناد اور اعتبار کا درجہ حاصل ہو، نہ کہ مسلم مورخین کی نقل کردہ تاریخی روایات پر۔ اور تحقیقی لحاظ سے اس لیے کہ جب تک قرآن وسنت کی تصریحات سے مسجد اقصیٰ کی تولیت کا حق مسلمانوں کے لیے ثابت نہ ہو جائے، مذکورہ تاریخی پیش گوئیوں کی کوئی حیثیت نہیں ہو سکتی۔ گویا اصل مسئلہ اس دعوے کے حق میں قرآن وسنت سے ثبوت فراہم کرنا ہے۔ اس کے بغیر اس استدلال کا سیدھا سیدھا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اپنے اقدامات کے لیے شرعی جواز قرآن وسنت سے نہیں بلکہ یہود

ونصاریٰ کے ہاں موجود پیش گوئیوں سے اخذ کرتے ہیں۔

مسلمانوں کے حق تولیت کا واقعاتی تسلسل

سطور بالا میں ہم اس نکتے پر سیر حاصل گفتگو کر چکے ہیں کہ اسلامی شریعت میں نہ مسجد اقصیٰ پر یہود کے حق تولیت کو منسوخ کیا گیا ہے اور نہ اس کے کسی حکم کا یہ تقاضا ہے کہ مسلمان اس کی تولیت کی ذمہ داری لازماً اٹھائیں۔ اس حوالے سے جو استدلال پیش کیا گیا ہے، وہ علمی لحاظ سے بے حد کمزور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض جید اہل علم تولیت کے اس حق کو محض حالات وواقعات کا نتیجہ تسلیم کرتے اور واقعاتی حقائق ہی کو مسلمانوں کے حق تولیت کی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''ہیکل سلیمانی کے متعلق یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ ۷۰ء میں بالکل مسمار کر دیا گیا تھا اور حضرت عمر کے زمانے میں جب بیت المقدس فتح ہوا، اس وقت یہاں یہودیوں کا کوئی معبد نہ تھا بلکہ کھنڈر پڑے ہوئے تھے اس لیے مسجد اقصیٰ اور قبہ صخرہ کی تعمیر کے بارے میں کوئی یہودی یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ ان کے کسی معبد کو توڑ کر مسلمانوں نے یہ مساجد بنائی تھیں۔''

(ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۹ء)

حکیم الامت علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''صدیاں گزر گئیں کہ ایک معبد تعمیر ہوا تھا جسے ہیکل سلیمانی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ معبد مسلمانوں کے یروشلم فتح کرنے سے بہت پہلے برباد ہو گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کا ذکر حضرت عمر فاروقؓ سے فرمایا تو انہیں ہیکل یا مسجد اقصیٰ کے صحیح موقع ومحل سے بھی مطلع کر دیا۔ فتح یروشلم کے بعد حضرت عمرؓ بہ نفس نفیس یروشلم تشریف لے گئے تو انہوں نے مسمار شدہ ہیکل کا محل وقوع دریافت فرمایا اور وہ جگہ ڈھونڈ لی۔ اس وقت اس جگہ گھوڑوں کی لید جمع تھی جسے انہوں نے اپنے ہاتھ سے صاف کیا۔ مسلمانوں نے جب اپنے خلیفہ کو ایسا کرتے دیکھا تو انہوں نے بھی جگہ صاف کرنی شروع کر دی اور یہ میدان پاک ہو گیا۔ عین اسی جگہ مسلمانوں نے ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کی جس کا نام مسجد اقصیٰ ہے۔ یہود ونصاریٰ کی تاریخ میں تو یہ کہیں مذکور نہیں کہ موجودہ مسجد اقصیٰ اسی جگہ پر واقع ہے جہاں ہیکل سلیمانی واقع تھا۔ اس تشخیص کا سہرا مسلمانوں کے سر ہے۔ یہود ونصاریٰ نے اس کی زیارت کے لیے اس وقت آنا شروع کیا جب یہ مشخص ہو چکی تھی۔''

(انقلاب، ۱۰ستمبر ۱۹۲۹ء بحوالہ المعارف، اقبال نمبر، ستمبر اکتوبر ۱۹۷۷ء، ۸۰)

اس استدلال کو مکمل انداز میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ چونکہ مسلمانوں نے اس مقام کو یہودیوں سے چھین کر یا ہیکل کو گرا کر یہاں مسجد اقصیٰ کو تعمیر نہیں کیا بلکہ انہوں نے اس عبادت گاہ کو اس وقت تعمیر اور آباد کیا جب یہ بربادی، ویرانی اور خستہ حالی کا شکار تھی، نیز گزشتہ تیرہ صدیوں سے مسلمان اس کی تولیت کے امور کے ذمہ دار چلے آ رہے ہیں اور اقوام متحدہ نے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بھی اسی بنیاد پر ان کے اس حق کو قانونی اور جائز تسلیم کیا ہے، اس لیے اب یہود کے اس پر کسی قسم کا حق جتانے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

ہم اس بحث کے آغاز میں یہ عرض کر چکے ہیں کہ قانونی لحاظ سے اس استدلال کے درست ہونے میں کوئی شبہ نہیں، لیکن ہمیں اس بات کو ماننے میں شدید تردد ہے کہ یہ موقف اس اعلیٰ اخلاقی معیار کے ساتھ بھی مطابقت رکھتا ہے جس کی تعلیم اہل کتاب اور ان کی عبادت گاہوں کے متعلق اسلام نے دی ہے۔

آیئے، پہلے اس حوالے سے اسلامی تعلیمات کا جائزہ لیتے ہیں:

عبادت گاہوں کے متعلق اسلام کا رویہ

قرآن مجید کے نزدیک دین کا اصل الاصول خدا کی یاد اور اس کی عبادت ہے اس لیے وہ اعتقادات کے باہمی امتیاز، طریقہ ہائے عبادت کے اختلاف اور احکام وشرائع کے فرق کے باوجود اہل کتاب کی عبادت گاہوں کو اللہ کی یاد کے مراکز تسلیم کرتا، انھیں مساجد کے ساتھ یکساں طور پر قابل احترام قرار دیتا اور ان کی حرمت وتقدس کی حفاظت کا حکم دیتا ہے:

وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا. (الحج ۲۲:۴۰)

''اور اگر اللہ نے (دنیا میں) ایک گروہ کے ظلم وعدوان کو دوسرے گروہ کے ذریعے سے دفع کرنے کا قانون نہ بنایا ہوتا تو راہب خانوں، کلیساؤں، گرجوں اور مسجدوں جیسے مقامات، جن میں اللہ کو کثرت سے یاد کیا جاتا ہے، گرا دیے جاتے۔''

خدا کی عبادت میں اشتراک کے اس تصور سے آسمانی مذاہب کے ماننے والوں کے مابین جو باہمی رویہ پیدا ہوتا ہے، وہ ظاہر ہے کہ رواداری، مسامحت اور احترام کا رویہ ہے۔ اسلامی تعلیمات میں اس کا ایک مظہر یہ ہے کہ بوقت ضرورت مسلمانوں کو اہل کتاب کی عبادت گاہوں میں اور اہل کتاب کو مسلمانوں کی مساجد میں عبادت کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ چنانچہ صحابہ میں سے حضرت عمر، حضرت عبداللہ ابن عباس، حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور تابعین میں سے ابراہیم نخعی، اوزاعی، سعید بن عبدالعزیز، حسن بصری، عمر بن عبدالعزیز، شعبی، عطا اور ابن سیرین رحمہم اللہ جیسے جلیل القدر اہل علم سے کلیساؤں میں نماز پڑھنے کی اجازت اور بوقت ضرورت اس پر عمل کرنا منقول ہے۔[۴۳]

دوسری طرف ۹ ہجری میں جب نجران کے عیسائیوں کا وفد مدینہ منورہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو

۴۳؎ بخاری، باب الصلاۃ فی البیعۃ۔ مصنف ابن ابی شیبہ ۲/۷۹۔ نیل الاوطار ۲/۱۶۲۔ المجموع شرح المہذب ۳/۱۶۴۔ فقہ السنۃ ۱/۲۱۵۔

آپ نے انہیں مسجد نبوی میں ٹھہرایا۔ جب عصر کی نماز کا وقت آیا اور انہوں نے نماز پڑھنی چاہی تو صحابہ نے ان کو روکنا چاہا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انہیں نماز پڑھنے دو چنانچہ انہوں نے مشرق کی سمت میں اپنے قبلے کی طرف رخ کر کے نماز ادا کی۔[۴۴]

عبادت گاہوں کے تقدس واحترام کی اسی تصور کے پیش نظر قرآن مجید نے مذہبی اختلافات کی بنیاد پر لوگوں کو اللہ کی عبادت سے روکنے یا اس کی عبادت کے لیے قائم کیے گئے مراکز پر تعدی کرنے کو ایک سنگین ترین اور ناقابل معافی جرم ہے۔ یہود و نصاریٰ کے مابین اعتقادات اور قبلے کی سمت میں اختلاف کی بنیاد پر ایک دوسرے کو عبادت سے روکنے اور عبادت گاہوں پر تعدی کے واقعات ان کی پوری تاریخ میں رونما ہوتے رہے ہیں۔ قرآن مجید نے اس طرز عمل پر نہایت سخت الفاظ میں تنقید کرتے ہوئے فرمایا:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَاط اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُق فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ.
(البقرہ ۲: ۱۱۴، ۱۱۵)

''اور اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ کی مسجدوں میں اس کے نام کا ذکر کرنے میں رکاوٹ ڈالے اور مسجدوں کو ویران کرنے کی کوشش کرے؟ ان کا حق تو یہی تھا کہ وہ ان مسجدوں میں داخل ہوں تو اللہ کے خوف وخشیت ہی کی حالت میں داخل ہوں۔ ان کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی ان کے لیے عذاب عظیم ہے۔ مشرق اور مغرب اللہ ہی کے لیے ہیں۔ سو تم جس طرف بھی رخ کرو، اللہ کی ذات اسی طرف ہے۔ بے شک اللہ بہت وسعت دینے والا علم رکھنے والا ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

عہد رسالت میں مشرکین مکہ نے متعدد مواقع پر مسلمانوں کو مسجد حرام میں جانے اور وہاں عبادت کرنے سے روک دیا جس کی بنا پر خدشہ تھا کہ مسلمان بھی موقع ملنے پر ان کے قافلوں اور عازمین حج کو روکنے لگیں گے، چنانچہ قرآن مجید نے بیت اللہ کے طواف و زیارت کا قصد کرنے والوں اور ان کے قربانی کے جانوروں سے کسی بھی قسم کا تعرض کرنے پر پابندی عائد کر دی:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا وَلَا

''اے ایمان والو، اللہ کے شعائر اور حرام مہینوں اور قربانی کے جانوروں اور ان کے پٹوں اور بیت الحرام کا قصد کرنے والوں کی بے حرمتی نہ کرو جو اللہ کے فضل اور اس کی رضا کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ اور جب تم احرام سے نکل آؤ

۴۴؎ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام، ۱۰۸/۴۔ سیرت النبی، شبلی نعمانی، ۲۴/۲۔

يَجُرِمَنَّكُمُ شَنَاٰنُ قَوُمٍ اَنُ صَدُّوُكُمُ عَنِ الُمَسُجِدِ الُحَرَامِ اَنُ تَعُتَدُوُا وَتَعَاوَنُوُا عَلَى الُبِرِّ وَالتَّقُوٰى وَلَا تَعَاوَنُوُا عَلَى الُاِثُمِ وَالُعُدُوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيُدُ الُعِقَابِ. (المائدہ۵:۲)

تو شکار کر سکتے ہو۔ اور اگر کسی گروہ نے تمھیں مسجد حرام سے روکا ہے تو ان کے ساتھ دشمنی تمھیں اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم بھی ان کے ساتھ زیادتی کرو۔ نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تو ایک دوسرے کی مدد کرو لیکن گناہ اور زیادتی کے کاموں میں تعاون نہ کرو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ نہایت سخت سزا دینے والا ہے۔''

اسی ضمن میں یہ ضابطہ بھی اسلامی تعلیمات کا ایک ناقابل تبدیل حصہ ہے کہ کسی مخصوص عبادت گاہ کی تولیت اور اس کے امور میں تصرف اور فیصلے کا حق اسی مذہب کے متبعین کو حاصل ہے جنھوں نے اس کو قائم کیا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود مدینہ کے ساتھ میثاق میں 'لليهود دينهم وللمسلمين دينهم ' کی شق شامل کر کے ان کے تمام مذہبی حقوق کے احترام وحفاظت کی پابندی قبول کی۔( ) اسی طرح نجران کے مسیحیوں ساتھ معاہدے میں یہ شق شامل تھی کہ:

ولنجران وحاشيتها ذمة الله وذمة رسوله اللّٰه على دمائهم واموالهم وملتهم وبيعهم ورهبانيتهم واساقفتهم وشاهدهم وغائبهم وكل ما تحت ايديهم من قليل او كثير وعلى ان لا يغيروا اسقفا من سقيفاه ولا واقها من وقيهاه ولا راهبا من رهبانيته.

(الاموال، ابوعبید، ص ۱۱۸۔ السیر ۃ النبویہ لابن ہشام ۱۰۸/۴۔ سنن البیہقی ۲۹۲/۹)

''بنو نجران اور ان کے تابعین کی جان ومال، دین اور عبادت گاہوں، راہبوں اور پادریوں کو، غائب اور موجود سب کو اللہ اور اس کے رسول کا ذمہ حاصل ہے۔ ان کے پاس موجود ہر تھوڑی یا زیادہ چیز کی حفاظت کی بھی ضمانت دی جاتی ہے، اور اس بات کی بھی کہ ان کے کسی پادری یا گرجے کے منتظم یا راہب کو اس کے منصب سے ہٹایا نہیں جائے گا۔''

سیدنا ابوبکرؓ نے جیش اسامہ کو روانگی کے وقت جو ہدایات دیں، ان میں سے ایک یہ تھی کہ:

ولا تهدموا بيعة.

(ابن عساکر، تہذیب تاریخ دمشق الکبیر، ۱۳۴/۱)

''اور تم کسی گرجے کو نہ گرانا۔''

وسوف تمرون باقوام قد فرغوا انفسهم فى الصوامع فدعوهم وما فرغوا انفسهم

''اور تمہارا گزر کچھ ایسے لوگوں پر ہوگا جنھوں نے اپنے آپ کو خانقاہوں میں بند کر رکھا ہو۔ تم ان کو ان کے حال پر

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

له۔ (ایضاً، ۱/۱۱۸، ۱۱۹) ہی چھوڑ دینا۔‘‘

سیدنا عمر نے اہل بیت المقدس کو جو تحریری امان دی، اس کے الفاظ یہ ہیں:

هذا ما اعطى عبد الله عمر امير المومنين اهل ايلياء من الامان، اعطاهم امانا لانفسهم واموالهم ولكنائسهم وصلبانهم وسقيمها وبريئها وسائر ملتها، انه لا تسكن كنائسهم ولا تهدم ولا ينتقض منها ولا من حيزها ولا من صليبهم ومن احب من اهل ايلياء ان يسير بنفسه وماله مع الروم ويخلى بيعهم وصلبهم فانهم آمنون على انفسهم وعلى بيعهم وصلبهم حتى يبلغوا مامنهم. (تاریخ طبری، ۳/۶۰۹)

’’یہ وہ امان ہے جو اللہ کے بندے امیر المومنین عمر نے اہل ایلیا کو دی۔ یہ امان ان کی جان، مال، گرجا، صلیب، تندرست، بیمار اور ان کے تمام مذہب والوں کے لیے ہے۔ نہ ان کے گرجاؤں میں سکونت کی جائے گی اور نہ وہ ڈھائے جائیں گے، نہ ان کو یا ان کے احاطے کو کوئی نقصان پہنچایا جائے گا۔ ایلیا کے باسیوں میں سے جو یہ چاہیں کہ اپنی جان و مال لے کر رومیوں کے ساتھ چلے جائیں اور اپنے گرجے اور صلیبیں چھوڑ جائیں تو ان کی جانوں، گرجوں اور صلیبوں کو امان حاصل ہے یہاں تک کہ وہ کسی پر امن جگہ پر پہنچ جائیں۔‘‘

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

عہد صحابہ کی فتوحات میں اہل کتاب کے ساتھ کیے جانے والے کم و بیش تمام معاہدوں میں ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت کی ضمانت کا ذکر ملتا ہے۔[۴۵]

چنانچہ اسلام کی انھی تعلیمات و ہدایات کی روشنی میں اسلامی تاریخ کے صدر اول میں غیر مسلموں کے فتح ہونے والے علاقوں میں دیگر مذاہب کی پہلے سے موجود عبادت گاہوں کو علیٰ حالہا قائم رکھنے اور ان کے مذہبی معاملات سے تعرض نہ کرنے کی شاندار روایت قائم کی گئی۔ ابن قدامہ ’’المغنی‘‘ میں لکھتے ہیں:

’’عبداللہ ابن عباس سے روایت ہے کہ: جس شہر کے بانی عجم ہوں اور اللہ تعالیٰ عربوں کو اس پر فتح عطا کر دے اور وہ اس میں داخل ہو جائیں تو اہل عجم کے معاملات حسب سابق برقرار رکھے جائیں گے۔ نیز صحابہ کرام نے بہت سے شہروں پر بزور قوت فتح حاصل کی لیکن انھوں نے اہل کتاب کی عبادت گاہوں میں سے کسی کو بھی منہدم نہیں کیا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ان علاقوں میں یہود اور نصاریٰ کی عبادت گاہیں موجود ہیں اور معلوم ہے کہ یہ اسلامی فتوحات کے بعد نہیں بنائی گئیں چنانچہ لازماً یہ پہلے سے موجود تھیں اور ان کو برقرار رکھا گیا۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اپنے عمال کو لکھا تھا کہ وہ یہود و نصاریٰ یا مجوس میں سے کسی کی عبادت گاہ کو منہدم نہ کریں۔ پھر یہ کہ اس بات پر مسلمانوں کا اجماع ہو چکا ہے کیونکہ یہ عبادت گاہیں مسلمانوں

۴۵؎ مثلاً دیکھیے: معاہدۂ دمشق (ابن عساکر، تہذیب تاریخ دمشق الکبیر، ۱/۱۴۹۔ الاموال لابی عبید ص ۲۰۷) معاہدۂ طفلیس (الاموال ص ۲۰۸، ۲۰۹) معاہدۂ حلب (تاریخ ابن خلدون اردو ۱/۳۳۴) معاہدۂ لد و فلسطین (تاریخ طبری ۳/۶۰۹) وغیرہ۔

کے علاقوں میں موجود ہیں اور کسی کو اس پر کوئی اعتراض نہیں۔'' (المغنی، ۹/۲۸۴)

عہد صحابہ میں اس روایت کی پاس داری کا عالم یہ رہا کہ بیت المقدس کی فتح کے موقع پر جب سیدنا عمر وہاں تشریف لے گئے تو مسیحی بطریق صفرنیوس نے انھیں مقدس مذہبی مقامات کی زیارت کرائی۔ اس دوران میں جب وہ کلیسائے قیامت میں گئے تو نماز کا وقت آ گیا۔ بطریق نے سیدنا عمر سے گزارش کی کہ وہ وہیں نماز ادا کر لیں لیکن سیدنا عمر نے فرمایا کہ اگر آج انھوں نے یہاں نماز ادا کی تو بعد میں مسلمان بھی ان کے اس عمل کی پیروی میں یہاں نماز ادا کریں گے اور اس سے مسیحیوں کے لیے مشکلات پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

اسی طرح جب کلیسائے قسطنطین کے دروازے پر مسیحی میزبانوں نے سیدنا عمر کے نماز پڑھنے کے لیے بساط بچھائی تو آپ نے پھر معذرت فرما دی۔

بیت لحم میں کلیسائے مہد کی زیارت کے موقع پر نماز کا وقت آیا تو سیدنا عمر نے وہاں نماز ادا کر لی لیکن پھر اندیشہ ہوا کہ ان کا یہ عمل بعد میں مسیحیوں کے لیے دقت کا باعث نہ بن جائے چنانچہ ایک خاص عہد لکھ کر بطریق کو دے دیا جس کی رو سے یہ کلیسا مسیحیوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا اور پابندی لگا دی گئی کہ ایک وقت میں صرف ایک مسلمان اس میں داخل ہو سکے گا، اس سے زیادہ نہیں۔[46]

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اسلامی سلطنت کے عین عروج کے زمانے میں امیر المومنین سیدنا معاویہ نے یہ چاہا کہ دمشق میں کنیسہ یوحنا کے نصف حصے کو، جو عیسائیوں کے زیر تصرف تھا، ان کی رضا مندی سے مسجد میں شامل کر لیں لیکن عیسائیوں کے اس بات سے اتفاق نہ کرنے کی وجہ سے وہ اس خیال کو عملی جامہ نہ پہنا سکے اور انھیں یہ ارادہ ترک کر دینا پڑا۔[47]

اس تفصیل سے اہل کتاب اور ان کی عبادت گاہوں کے بارے میں اسلامی تعلیمات کے رخ اور مزاج کا پوری طرح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کو پیش نظر رکھیے تو ہر شخص یہ ماننے پر مجبور ہوگا کہ مسجد اقصیٰ کے معاملے میں کوئی فیصلہ کرنے کے لیے اصل معیار کی حیثیت محض قانونی اور واقعاتی استحقاق کو نہیں بلکہ ان اعلیٰ اخلاقی اصولوں کو حاصل ہونی چاہیے جن کی رعایت کی تلقین اسلام نے اہل کتاب کے حوالے سے کی ہے۔

اخلاقی لحاظ سے اس معاملے کی نوعیت کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ حسب ذیل حقائق پیش نظر رہیں:

---

[46] محمد حسین ہیکل: ''حضرت عمر'' مترجم: حبیب اشعر، ص ۳۰۱، ۳۰۲۔

[47] بلاذری، فتوح البلدان اردو، ۱/۱۹۱۔ ولید بن عبد الملک نے اپنے زمانے میں جبراً عیسائیوں کے حصے کو بھی مسجد میں شامل کر لیا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز کا دور آیا تو عیسائیوں کی شکایت پر انھوں نے حکم دیا کہ ''مسجد میں جو اضافہ کیا گیا ہے، وہ نصاریٰ کو واپس دے دیا جائے۔'' تاہم باہمی گفت و شنید سے یہ طے پایا کہ اس گرجے کے بدلے میں عیسائیوں کو الغوطہ کے علاقے میں ایک دوسرا گرجا دے دیا جائے۔ (فتوح البلدان، حوالہ بالا)

ایک یہ کہ مسجد اقصیٰ کی حیثیت یہود کے نزدیک کسی عام عبادت گاہ کی نہیں بلکہ وہی ہے جو مسلمانوں کے نزدیک مسجد حرام اور مسجد نبوی کی ہے۔ مسلمان، اپنی عام عبادت گاہوں کے برخلاف، ان دونوں مساجد کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ اگر خدانخواستہ کبھی وہ ان کے ہاتھ سے چھن جائیں اور کسی دوسرے مذہب کے پیروکار اسے اپنی مذہبی یا دنیاوی سرگرمیوں کا مرکز بنالیں تو ان پر سے مسلمانوں کا حق ختم ہو جائے گا۔ اپنے قبلے کے بارے میں یہی احساسات وجذبات دنیا کے تمام مذاہب کے ماننے والوں میں پائے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی عبادت گاہوں کے حوالے سے مانا جانے والا یہ اصول، عدل وانصاف کی رو سے، دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کے لیے بھی تسلیم کیا جانا چاہیے۔

دوسرے یہ کہ ہیکل سلیمانی کو یہود نے اپنے اختیار اور ارادے سے ویران نہیں کیا بلکہ اس کی بربادی اور حرمت کی پامالی ایک حملہ آور بادشاہ کے ہاتھوں ہوئی جس نے جبراً یہود کو یہاں سے بے دخل کر کے اس عبادت گاہ کے ساتھ ان کے تعلق کو منقطع کر دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان پر یہ ذلت ورسوائی اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا کے طور پر مسلط ہوئی، لیکن اہل علم جانتے ہیں کہ یہ چیز تکوینی امور میں سے ہے جو اپنی نوعیت اور حیثیت کے لحاظ سے ہمارے لیے قابل اتباع نہیں ہیں، چنانچہ اس دائرے کے امور کو نہ کسی شرعی حکم کے استنباط کے لیے ماخذ بنایا جا سکتا ہے اور نہ کسی طرز عمل کے لیے دلیل۔

تیسرے یہ کہ اس عبادت گاہ کے ساتھ قوم یہود کی قلبی وابستگی اور اس کی بازیابی کے لیے ان کی تمناؤں اور امیدوں کی تصویر خود مولانا مودودی رحمہ اللہ نے یوں پیش کی ہے:

> ''دو ہزار برس سے دنیا بھر کے یہودی ہفتے میں چار مرتبہ یہ دعائیں مانگتے رہے ہیں کہ بیت المقدس پھر ہمارے ہاتھ آئے اور ہم ہیکل سلیمانی کو پھر تعمیر کریں۔ ہر یہودی گھر میں مذہبی تقریبات کے موقع پر اس تاریخ کا پورا ڈراما کھیلا جاتا رہا ہے کہ ہم مصر سے کس طرح نکلے اور فلسطین میں کس طرح سے آباد ہوئے اور کیسے بابل والے ہم کو لے گئے اور ہم کس طرح سے فلسطین سے نکالے گئے اور تتر بتر ہوئے۔ اس طرح یہودیوں کے بچے بچے کے دماغ میں یہ بات ۲۰ صدیوں سے بٹھائی جا رہی ہے کہ فلسطین تمھارا ہے اور تمھیں واپس ملنا ہے اور تمھارا مقصد زندگی یہ ہے کہ تم بیت المقدس میں ہیکل سلیمانی کو پھر تعمیر کرو۔ بارھویں صدی عیسوی کے مشہور یہودی فلسفی موسیٰ بن میمون (Maimonides) نے اپنی کتاب شریعت یہود (The Code of Jewish Law) میں صاف صاف لکھا ہے کہ ہر یہودی نسل کا یہ فرض ہے کہ وہ بیت المقدس میں ہیکل سلیمانی کو از سر نو تعمیر کرے۔ مشہور فری میسن تحریک (Freemason Movement) بھی، جس کے متعلق ہمارے ملک کے اخبارات میں قریب قریب سارے ہی حقائق اب شائع ہو چکے ہیں، اصلاً ایک یہودی تحریک ہے اور اس میں بھی ہیکل سلیمانی کی تعمیر نو کو مقصود قرار دیا گیا ہے بلکہ پوری فری میسن تحریک کا مرکزی تصور یہی ہے اور تمام فری میسن لاجوں میں اس کا باقاعدہ ڈراما ہوتا ہے کہ کس طرح سے ہیکل سلیمانی کو دوبارہ تعمیر کرنا ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مسجد اقصیٰ میں آگ لگنا کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے۔ صدیوں سے یہودی قوم کی زندگی کا نصب العین یہی رہا ہے کہ وہ مسجد اقصیٰ کی جگہ ہیکل سلیمانی کو تعمیر کرے اور اب بیت المقدس پر ان کا قبضہ ہو جانے کے بعد یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے اس نصب العین کو پورا

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کرنے سے باز رہ جائیں۔''(ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۹ء)

چوتھے یہ کہ یہودیوں کی بہت سی عباداتی رسوم، بالخصوص قربانیاں، ایسی ہیں جوان کے مذہبی قانون کے مطابق ہیکل کے ساتھ مخصوص ہیں اور اس کے بغیر ان کی ادائیگی فقہی لحاظ سے درست نہیں ہے۔ گویا مسجد اقصیٰ سے ان کو روکنا محض ایک عبادت گاہ سے محروم رکھنے کا معاملہ نہیں بلکہ ان کے اپنی مذہبی رسوم کو بجالانے کے حق کی نفی کو بھی مستلزم ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جس مرکز عبادت سے اہل مذہب کو اس کی شدید ترین بے حرمتی کرنے کے بعد بے دخل کر دیا گیا ہو، جن کے مذہبی قانون میں اس کی تولیت کی ذمہ داری کسی دوسرے گروہ کے سپرد کرنے کی ممانعت کی گئی ہو، اور اس کو دوبارہ بحال کرنے کے لیے ان کے مذہبی جذبات کا عالم یہ ہو جو اوپر کے اقتباس میں بیان ہوا ہے، اس کے بارے میں اس استدلال کی عقل و اخلاق اور دین اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں کیا حیثیت ہوگی کہ چونکہ ہم نے اہل مذہب کی غیر موجودگی میں اس مقام پر عمارت تعمیر کر لی ہے اور صدیوں سے اس میں عبادت انجام دیتے چلے آ رہے ہیں، اس لیے اس کے حوالے سے ان کے تمام حقوق بیک قلم منسوخ ہو گئے ہیں؟ کیا ایک کھوئے ہوئے مرکز عبادت میں ازسرنو جمع ہونے اور اس میں سلسلہ عبادت کے احیا کا جذبہ، فی الواقع، ایسا ہی قابل نفرت ہے کہ اسے اس طرح کی بے معنی سخن سازیوں سے بے وقعت کرنے کی کوشش کی جائے؟ کیا اگر، خاکم بدہن، یہود کے بجائے یہ صورت حال مسلمانوں کو درپیش ہوتی تو بھی وہ اس قسم کے استدلالات سے مطمئن ہو کر اپنے قبلے سے دست بردار ہو جاتے؟

مذہبی اخلاقیات کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ عبادت گاہوں کے بارے میں فیصلے کے لیے جس چیز کو سب سے بڑھ کر ملحوظ رکھا جانا چاہیے، وہ خود اہل مذہب کے اعتقادات اور ان کا مذہبی قانون ہے۔ اس اصول کی روشنی میں مذکورہ استدلال کی کم مائیگی بالکل واضح ہے۔[۴۸]

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۴۸؎ خود فقہ اسلامی کی بعض جزئیات اس استدلال کی صراحتاً نفی کرتی ہیں۔ جلیل القدر حنفی عالم ابن عابدین شامی نے یہ واقعہ ذکر کیا ہے کہ دمشق میں یہودیوں کا ایک فرقہ ''الیہود القرابین'' کے نام سے موجود تھا جس کی ایک عبادت گاہ بھی تھی۔ یہ فرقہ رفتہ رفتہ وہاں سے ناپید ہو گیا۔ ۱۲۴۸ھ میں ایک عرصے کے بعد اس فرقے سے تعلق رکھنے والا ایک مسافر دمشق میں آیا تو مقامی عیسائیوں نے اسے کچھ رقم ادا کر کے اس سے ان کی عبادت گاہ کو گرجا بنا لینے کی اجازت لے لی اور عیسائیوں کی قوت و شوکت کی بنا پر کچھ مقامی یہودی گروہوں نے بھی اس کی تائید کر دی۔ یہ معاملہ جب مسلم حکام کے علم میں آیا تو انھوں نے قانونی لحاظ سے اس کی پوزیشن معلوم کرنے کے لیے علماء فقہ سے رجوع کیا۔ ابن عابدین کہتے ہیں کہ بعض دنیا پرست علما نے اس معاملے کو درست قرار دے دیا لیکن میں نے اس کے حق میں فتویٰ دینے سے انکار کر دیا۔ اپنی اس رائے کی متعدد وجوہ میں سے ایک وجہ انھوں نے یہ بیان کی ہے کہ:

''ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ یہ عبادت گاہ چونکہ ایک مخصوص مذہب کے ماننے والوں کی تھی اس لیے اس مذہب کے کسی فرد کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اسے کسی دوسرے مذہب والوں کے حوالے کر دے، اگرچہ تمام اہل کفر ہمارے نزدیک ایک ہی ملت کا حکم رکھتے ہیں۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی مدرسہ مثال کے طور پر احناف کے لیے وقف کیا گیا ہو تو کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اسے کسی دوسرے

عالم عرب کا موقف ـــــ چند علمی و اخلاقی سوالات

مسجد اقصیٰ کی تولیت کے حوالے سے مذکورہ دونوں نقطہ ہائے نظر کی کمزوری ہم واضح کر چکے ہیں، تاہم اختلاف کے باوجود یہ ماننا چاہیے کہ ان کی غلطی اصلاً علمی ہے اور غلط فہمی کے اسباب بھی بڑی حد تک قابل فہم ہیں۔ لیکن بے حد افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس باب میں امت مسلمہ کا انحراف محض علمی غلط فہمیوں تک محدود نہیں رہا بلکہ اس کے رویے کا ایک پہلو ایسا بھی ہے جسے علمی و اخلاقی بد دیانتی اور مذہبی استحصال کا مظہر قرار دیے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ ذیل میں ہم اس کی کچھ تفصیل پیش کر رہے ہیں:

۱۔ ہیکل سلیمانی کے وجود سے انکار

اس وقت امت مسلمہ کے نمائندگی کرنے والے مذہبی وسیاسی راہنماؤں، صحافیوں اور ماہرین تاریخ کی اکثریت سرے سے ہیکل سلیمانی کے وجود کو ہی تسلیم نہیں کرتی۔ اس کے نزدیک ہیکل کا وجود محض ایک افسانہ ہے جو یہود نے مسجد اقصیٰ پر قبضہ کرنے کے لیے گھڑ لیا ہے۔ یہ خیال نہ ہو کہ اس خیال کا اظہار سطحی قسم کے غیر معتبر لوگ محض اپنی نجی مجالس میں کر دیتے ہیں۔ نہیں، امر واقعہ یہ ہے کہ اس نقطہ نظر کی وکالت اور ترجمانی کے فرائض مسلم دنیا کے چوٹی کے مذہبی اور سیاسی رہنما اعلیٰ ترین علمی اور ابلاغی سطحوں پر کر رہے ہیں۔

عالم عرب کے معروف اسکالر ڈاکٹر یوسف القرضاوی فرماتے ہیں:

> ''اپنے تمام تر ترقی یافتہ سائنسی، تکنیکی اور انجینئرنگ ساز وسامان کے ساتھ وہ تیس سال سے تلاش کر رہے ہیں کہ مفروضہ ہیکل سلیمانی کا کوئی نشان ہی مل جائے لیکن وہ اس میں ناکام ہیں۔ اس نام نہاد ہیکل سلیمانی کے وجود کا امکان ہی کہاں ہے؟'' (http://www.mkis.org/FatawasResults.asp?Id=2)

فلسطین کے موجودہ مفتی اعظم عکرمہ صبری صاحب نے ۱۷ جنوری ۲۰۰۱ء کو جرمن اخبار ڈائی ویلٹ (Die Welt) کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا:

> ''ماضی میں اس مقام پر یہودی ہیکل کے وجود کا کوئی معمولی سا بھی ثبوت موجود نہیں ہے۔ پورے شہر میں کوئی ایک پتھر بھی ایسا نہیں جو یہودی تاریخ پر دلالت کرتا ہو۔ اس کے بالمقابل ہمارا حق بالکل واضح ہے۔ یہ مقام پندرہ صدیوں سے ہمارا ہے۔ حتیٰ کہ جب صلیبیوں نے اسے فتح کیا تو بھی یہ اقصیٰ ہی رہا اور ہم نے جلد ہی اسے واپس لے لیا۔ یہودی تو یہ تک نہیں جانتے کہ ان کے ہیکل کا ٹھیک ٹھیک محل وقوع کیا تھا اس لیے ہم اس مقام پر سطح زمین کے نیچے یا اس کے اوپر ان کا کوئی حق تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔''

فقہی مسلک کے تصرف میں دے دے، اگرچہ دین دونوں کا ایک ہے۔'' (رد المحتار ۴/ ۲۰۵)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

جب ان سے کہا گیا کہ ماہرین آثار قدیمہ تو اس پر متفق ہیں کہ مغربی دیوار فی الحقیقت تباہ شدہ ہیکل ہی کی دیوار ہے تو انھوں نے جواباً فرمایا:

''دنیا کو دھوکا دینا یہودیوں کا خاص فن ہے لیکن وہ ہمیں دھوکہ نہیں دے سکتے۔ مغربی دیوار کے ایک بھی پتھر کا یہودی تاریخ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہودیوں کے اس دیوار پر حق جتانے کا مذہبی یا تاریخی طور پر کوئی جواز نہیں۔ لیگ آف نیشنز کی کمیٹی نے ۱۹۳۰ء میں یہودیوں کو یہاں دعا کرنے کی اجازت صرف ان کو مطمئن کرنے کے لیے دی لیکن اس نے یہ ہرگز تسلیم نہیں کیا کہ اس دیوار پر ان کا کوئی حق ہے۔''

انھوں نے مزید فرمایا کہ

''میں نے سنا ہے کہ تمہارا ہیکل نابلس یا غالباً بیت لحم میں تھا۔'' (Makor Rishon, May 22, 1998)

ریڈیو میں فلسطینی اتھارٹی کے ڈائریکٹر آف اسلامک وقف شیخ اسماعیل جمال فرماتے ہیں:

''اسرائیل کے لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ الاقصیٰ کے نزدیک نہ ان کا کوئی ہیکل ہے اور نہ اس کے کوئی بچے کھچے آثار۔ قرآن مجید کی رو سے بنی اسرائیل بیت لحم کے مغرب میں کسی جگہ مقیم نہ تھے نہ کہ یروشلم میں۔''

(Chicago Jewish Sentinel, May 18, 1995)

فلسطینی رہنما یاسر عرفات نے ۲۰۰۰ء میں اسرائیلی وزیر اعظم ایہود باراک کے ساتھ مذاکرات کے دوران میں ہیکل سلیمانی کے وجود کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا:

''میں ایک مذہبی آدمی ہوں اور میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا کہ میرے ذکر میں یہ بات لکھی جائے کہ میں نے اس پہاڑی کے نیچے مفروضہ ہیکل کی موجودگی کو تسلیم کر لیا۔'' (الحیاۃ الجدیدۃ، ۱۲ اگست ۲۰۰۰ء)

رابطہ عالم اسلامی کی طرف سے ۷ ربیع الاول ۱۴۲۴ھ کو جاری کردہ ایک پریس ریلیز کے مطابق:

''رابطہ کے سیکرٹری جنرل الدکتور عبداللہ بن عبدالمحسن الترکی نے اس دعوے کو مسترد کیا ہے کہ مسجد اقصیٰ ہیکل سلیمانی کے کھنڈرات کے اوپر قائم ہے۔ انھوں نے واضح کیا کہ تاریخی دستاویزات اسرائیلیوں کے اس دعوے کے بطلان کو ثابت کرتی ہیں جس کا اعلان وہ مسجد کو گرا کر اس کی جگہ ہیکل کی تعمیر کے منصوبوں کی تکمیل کی غرض سے کرتے رہتے ہیں۔''

رابطہ عالم اسلامی کے سرکاری بیانات اور عرب اخبارات وجرائد میں لکھنے والے کم وبیش تمام اصحاب قلم کی تحریروں میں ہیکل سلیمانی کا ذکر کرتے ہوئے بالعموم 'الهيكل المزعوم' (مفروضہ ہیکل) کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ عرب میڈیا کے زیر اثر اب برصغیر کی صحافتی تحریروں میں بھی اس موقف کی بازگشت سنائی دینے لگی ہے، حتیٰ کہ دارالعلوم دیوبند جیسے موقر علمی ادارے کے ترجمان ماہنامہ ''دارالعلوم'' کے ایک حالیہ شمارے میں بھی اسی موقف کی ترجمانی کی گئی ہے۔[49]

حقائق وواقعات کی رو سے یہ موقف اس قابل نہیں کہ اس علمی وتاریخی بحث میں اس سے تعرض بھی کیا جائے۔ قرآن و

---

[49] اکتوبر ۲۰۰۲ء، ص ۴۵۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

سنت کی تصریحات، مسلمہ تاریخی حقائق، یہود ونصاریٰ کی مذہبی روایات، مسلمانوں کے تاریخی لٹریچر اور مسلم محققین کی تصریحات کی روشنی میں نہ اس بات میں کسی شک وشبہ کی گنجائش ہے کہ مسجد اقصیٰ دراصل ہیکل سلیمانی ہی ہے اور نہ اس دلیل میں کوئی وزن ہے کہ اثریاتی تحقیق کے نتیجے میں مسجد اقصیٰ کے نیچے ہیکل سلیمانی کے کوئی آثار دریافت نہیں ہو سکے۔ ہمیں یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ بدقسمتی سے اس حسن ظن کی بھی کوئی گنجائش نہیں کہ مذکورہ موقف کے وکلا شاید حقائق سے بے خبر ہیں یا کوئی غلط فہمی انھیں لاحق ہوگئی ہے۔ خود فلسطین کے مسلم رہنما اسرائیل کے وجود میں آنے اور بیت المقدس پر صہیونی قبضے سے قبل تک ان تاریخی حقائق کو تسلیم کرتے رہے ہیں اور انھیں جھٹلانے کی جسارت انھوں نے کبھی نہیں کی چنانچہ یروشلم پوسٹ کے ۲۶ جنوری ۲۰۰۰ء کے شمارے میں یروشلم کی سپریم مسلم کونسل کی ۱۹۳۰ء میں شائع کردہ ایک ٹورسٹ گائیڈ سے چند اقتباسات نقل کیے گئے ہیں جن میں سے دو حسب ذیل ہیں:

''یہ مقام دنیا کے قدیم ترین مقامات میں سے ہے۔ اس کے ہیکل سلیمانی ہونے میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں اور، جیسا کہ عالمی سطح پر مانا جاتا ہے، یہی وہ جگہ ہے جہاں حضرت داؤد نے خدا کے لیے ایک قربان گاہ بنائی اور سوختنی اور امن کی قربانیاں پیش کیں۔''

''سلیمان کے اصطبل'' کے بارے میں اس کتابچہ میں لکھا ہے:

''اس کمرے کی ابتدائی تاریخ کے بارے میں یقینی طور پر کچھ معلوم نہیں۔ غالباً اس کی تاریخ ہیکل سلیمانی کی تعمیر کے معاصر ہے۔... مورخ یوسفس کے مطابق ۷۰ عیسوی میں طیطس کے فتح یروشلم کے وقت یہ موجود تھے اور یہودیوں نے اسے پناہ گاہ کے طور پر استعمال کیا تھا۔''

۱۹۳۰ء ہی میں برطانوی ہائی کمیشن کے سامنے دیوار گریہ کے حوالے سے مسلم نمائندوں نے جو بیان دیا، اس میں کہا گیا:

''جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم یروشلم میں تشریف لائے تو قدیم ہیکل کے مقام کو، جو کہ پہلے ہی مسلمانوں کی عقیدت کا مرکز تھا، مسجد حرام کے مقابلے میں مسجد اقصیٰ کا نام دیا گیا۔ اس وقت مکہ کے لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن تھے، چنانچہ یروشلم اور بالخصوص ہیکل کا ایریا ایک مخصوص عرصے کے لیے مسلمانوں کا پہلا قبلہ قرار پائے۔''

اس سے واضح ہے کہ عالم عرب کا یہ کم وبیش اجماعی موقف، جس کو متعدد اکابر علمائے دین ومفتیان شرع متین کی تائید ونصرت بھی حاصل ہے اور جس کو مسلم اور عرب میڈیا تسلسل کے ساتھ دہرا رہا ہے، صاف طور پر کتمان حق اور تکذیب آیات اللہ کے زمرے میں آتا ہے۔

۲۔ مقامات مقدسہ کی شرعی پوزیشن

مسجد اقصیٰ کی فضیلت اور اس کے مقام ومرتبہ کے متعلق قرآن وحدیث میں متعدد بیانات موجود ہیں، جن میں سے بنیادی نوعیت کے نصوص کا ذکر سطور بالا میں کیا جا چکا ہے۔ لیکن مسجد اقصیٰ اور اس سے متعلق بعض مقامات کو مسلمانوں کے

'مقدس' مقامات ثابت کرنے اور عامۃ المسلمین میں اس حوالے سے جذباتی فضا پیدا کرنے کے لیے ذرائع ابلاغ کی سطح پر ایسے بہت سے تصورات کو بلاتمیز فروغ دیا جا رہا ہے جو علمی لحاظ سے بالکل بے بنیاد ہیں اور اکابر اہل علم نے ان کی واضح طور پر تردید کی ہے۔ ان ضمن میں یہاں چند تصریحات کو نقل کر دینا مناسب ہوگا:

۱۔ عرب دنیا کے اخبارات وجرائد بالالتزام مسجد اقصیٰ کا ذکر ''الحرم الشریف'' اور ''ثالث الحرمین'' کے القاب سے کرتے ہیں۔ ''حرم'' کا لفظ شریعت کی ایک خاص اصطلاح ہے جس کا مطلب ہے ایسا علاقہ جس کی حرمت وتقدس کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کے اندر بعض مخصوص پابندیاں عائد کر دی جائیں۔ مسجد اقصیٰ کا روئے زمین کی تیسری افضل ترین مسجد ہونا تو قابل اعتماد روایات سے ثابت ہے لیکن اس کے ''حرم'' ہونے کا کوئی ثبوت قرآن وسنت میں موجود نہیں ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''بیت المقدس میں ایسا کوئی مکان یا مقام نہیں جس کا نام حرم ہو اور نہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قبر اور نہ اس کے علاوہ کوئی اور مقام ہے جسے حرم کے نام سے موسوم کیا گیا ہو۔ صرف تین مقامات کے متعلق حرم کا لفظ استعمال ہوا ہے:

۱۔ حرم مکہ زادہ اللہ عزا وشرفا۔ اس کے حرم ہونے پر تمام امت مسلمہ کا اتفاق ہے۔

۲۔ حرم نبوی۔ جمہور علما کے نزدیک حرم نبوی عیر پہاڑ سے ثور پہاڑ تک ہے۔ اس کی حد تقریباً برید در برید ہے۔ جمہور علما جیسے امام مالک رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک یہ حرم ہے۔ اس سلسلے میں کئی مشہور حدیثیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں۔

۳۔ وج، طائف کے علاقے میں ایک وادی کا نام ہے۔ اس کے متعلق ایک حدیث ذکر کی جاتی ہے جو احمد رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں بیان کی ہے لیکن کتب صحاح میں مذکور نہیں اور اکثر علما کے نزدیک یہ حرم نہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے چنانچہ اس حدیث سے کسی نے حجت نہیں پکڑی۔

مذکورہ بالا تینوں مقامات کے ماسوا کوئی جگہ حرم نہیں۔ تمام علمائے امت اس مسئلہ میں متفق ہیں کیونکہ حرم وہ ہوتا ہے جس جگہ شکار کرنا یا نباتات کو کاٹنا یا اکھاڑنا اللہ نے حرام قرار دیا ہو لیکن مذکورہ تینوں مقامات کے سوا اللہ تعالیٰ نے کسی جگہ شکار کرنا یا نباتات کو اکھاڑنا حرام قرار نہیں دیا۔'' (ماہنامہ ترجمان الحدیث، اپریل ۱۹۸۱ء، ص ۲۶)

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

''دنیا میں کوئی حرم نہیں ہے، بیت المقدس نہ کوئی اور، سوائے ان دو حرموں (مکہ اور مدینہ) کے۔ ان کے علاوہ کسی جگہ کو حرم کہنا، جیسا کہ کئی جاہل لوگ حرم القدس اور حرم الخلیل کہتے ہیں، بالکل غلط ہے کیونکہ یہ دونوں اور ان کے علاوہ کوئی اور جگہ حرم نہیں ہے۔ اس بات پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ اور وہ حرم جس کے حرم ہونے پر پوری امت کا اجماع ہے، وہ حرم مکہ ہے۔ رہا مدینہ تو جمہور علما کے نزدیک اس کا بھی ایک حرم ہے جیسا کہ اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور احادیث موجود ہیں۔'' (مجموع الفتاویٰ ۲۶/۱۱۷)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

عبداللہ بن ہشام انصاری فرماتے ہیں:

''میں نے اس شہر (بیت المقدس) کے رہائشیوں میں سے بڑے بڑے لوگوں سے سنا ہے کہ وہ ''حرم قدس'' کا لفظ بولتے ہیں۔ وہ اس چیز کو حرام قرار دیتے ہیں جسے اللہ نے حلال کہا ہے اور ایسا کہہ کر وہ اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں۔'' (تحصیل الانس لزائر القدس بحوالہ ''فضیلت بیت المقدس اور فلسطین وشام'' ص ۴۳)

سعودی عرب کی فتویٰ کمیٹی نے اپنے فتویٰ نمبر ۵۳۸۷ میں لکھا ہے:

''ہمارے علم میں کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جس سے یہ پتہ چلے کہ مسجد اقصیٰ بھی مسجد حرام اور مسجد نبوی کی طرح حرم ہے۔''

(فتاویٰ اللجنۃ الدائمہ ۶/۲۲۷ بحوالہ بالا)

۲۔ قبۃ الصخرۃ ہیکل سلیمانی کی چٹان یعنی قربانی کے پتھر کے اوپر تعمیر کیا گیا ہے۔ اس پتھر کو یہود کے قبلہ کی حیثیت حاصل ہے لیکن اسلامی روایات میں اس کے لیے کوئی تقدس اور فضیلت ثابت نہیں۔ مستند تاریخی روایات کے مطابق سیدنا عمر جب مسجد اقصیٰ میں تشریف لائے تو انھوں نے نومسلم یہودی عالم کعب احبار سے پوچھا کہ ہمیں نماز کے لیے کون سی جگہ منتخب کرنی چاہیے؟ کعب نے کہا کہ اگر آپ صخرہ کے پیچھے نماز پڑھیں تو سارا بیت المقدس آپ کے سامنے ہوگا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح یہود کے قبلے کی تعظیم بھی ہو جائے گی۔ اس پر سیدنا عمر نے یہ کہہ کر ان کی تجویز مسترد کر دی کہ ''تمہارے ذہن پر ابھی تک یہودی اثرات موجود ہیں۔''[۵۰]

اس پتھر کی تعظیم کا تصور بعد کے زمانے میں سیاسی اغراض کے تحت باقاعدہ پیدا کیا گیا اور اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک نے اس پر ایک نہایت شاندار قبہ تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ ولید کے اس اقدام کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے ابن خلکان لکھتے ہیں:

''جب عبدالملک خلیفہ بنا تو اس نے ابن زبیر کی وجہ سے اہل شام کو حج کرنے سے روک دیا کیونکہ ابن زبیر حج کی غرض سے مکہ مکرمہ آنے والے لوگوں سے اپنے لیے بیعت لیتے تھے۔ جب لوگوں کو حج سے روکا گیا تو انھوں نے بہت شور کیا چنانچہ عبدالملک نے بیت المقدس میں صخرہ کے اوپر عمارت بنا دی اور لوگ عرفہ کے دن یہاں حاضر ہو کر وقوف کی رسم ادا کرنے لگے۔''

(وفیات الاعیان ۳/۷۲)

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''صخرہ کے پاس حضرت عمر نے نماز پڑھی نہ صحابہ کرام نے۔ نیز خلفاے راشدین کے زمانہ میں اس پر کوئی گنبد نہیں تھا۔ چنانچہ حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت معاویہ، یزید اور مروان کے عہد حکومت میں ننگا تھا۔ پھر جب عبدالملک بن مروان نے ملک شام کو فتح کیا اور اس کے اور ابن زبیر کے مابین اختلاف کی خلیج بڑھ گئی تو لوگ حج کر کے حضرت عبداللہ بن زبیر کے پاس اکٹھے ہو جاتے تھے۔ یہ بات عبدالملک کو ناگوار گزری۔ اس نے چاہا کہ لوگوں کو ابن زبیر کے پاس جانے

۵۰؎ مسند احمد، ۱/۳۸۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

سے روکا جائے۔ چنانچہ اس نے صخرہ پر ایک قبہ بنا دیا اور سردی گرمی میں اس پر غلاف دینے کا رواج شروع کیا تا کہ لوگوں کے دلوں میں بیت المقدس کی زیارت کا شوق پیدا ہو اور ابن زبیر کے پاس جمع ہونے سے ہٹ جائیں۔ صحابہ کرام اور تابعین میں اہل علم اس صخرہ کی تعظیم نہیں کرتے تھے۔'' (ماہنامہ ترجمان الحدیث، اپریل ۱۹۸۱ء، ص ۲۳)

سیاسی اغراض کے تحت کیے جانے والے اس اقدام کو مذہبی استناد عطا کرنے کے لیے رفتہ رفتہ قبۃ الصخرۃ کے تقدس اور فضیلت کے متعلق اوہام وخرافات (Myths) کا ایک مجموعہ وجود میں آ گیا جن کی تردید اکابر اہل علم مسلسل کرتے چلے آ رہے ہیں۔ عوام الناس میں پھیلے ہوئے ان بے بنیاد اوہام اور ان کے متعلق اہل علم کی آرا کو حافظ محمد اسحٰق زاہد نے ذیل کے اقتباس میں بہت خوبی کے ساتھ جمع کر دیا ہے:

''یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ قبۃ الصخرۃ کی الگ کوئی فضیلت نہیں ہے۔ اگر کوئی فضیلت ہے تو وہ محض اس کے مسجد اقصیٰ کے اندر واقع ہونے کی وجہ سے ہے۔ کچھ لوگوں نے اس کے متعلق بے بنیاد باتیں پھیلا رکھی ہیں، مثلاً یہ کہ:

۱۔ اس کے اوپر ایک موتی رات کے وقت سورج کی طرح چمکتا تھا، پھر بخت نصر نے اسے خراب کر دیا تھا۔

۲۔ یہ جنت کے پتھروں میں سے ایک ہے۔

۳۔ زمین کے تمام پانی اسی قبۃ الصخرۃ کے نیچے سے جاری ہوتے ہیں۔

۴۔ یہ قبہ فضا میں لٹکا ہوا ہے، زمین سے جڑا ہوا نہیں ہے۔

۵۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں اور فرشتوں کی انگلیوں کے نشانات ہیں۔

۶۔ یہ اللہ کا زمینی عرش ہے اور خطہ زمین کے عین وسط میں واقع ہے۔

۷۔ اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کے لیے آسمانوں کی طرف لے جایا گیا اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم روانہ ہوئے تو یہ بھی اوپر اٹھ گیا تھا، لیکن جبریل علیہ السلام نے اسے ٹھہر جانے کا حکم دیا تو یہ ٹھہر گیا۔

۸۔ قبۃ الصخرۃ کی مسجد اقصیٰ میں وہی فضیلت ہے جو کہ خانہ کعبہ میں جڑے ہوئے حجر اسود کی ہے۔

قبۃ الصخرۃ کے بارے میں یہ اور اس طرح کی دیگر خرافات زبان زد عام ہیں، جن قطعاً کوئی ثبوت نہیں ہے۔ امام ابن القیم رحمہ اللہ صخرہ کے متعلق تمام احادیث کو جھوٹا قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

وكل حديث في الصخرة فهو كذب مفترى والقدم الذي فيها كذب موضوع مما عملته ايدي المزورين الذين يروجون لها ليكثر سواد الزائرين. (المنار المنیف، ۸۷)

''صخرہ کے متعلق تمام احادیث جھوٹی اور من گھڑت ہیں اور اس میں (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے) قدموں کے جو نشانات بتائے جاتے ہیں، وہ بھی جھوٹے ہیں اور جھوٹے لوگوں کی طرف سے بنائے گئے ہیں، اور وہی انھیں مشہور بھی کرتے ہیں تا کہ زائرین کی تعداد میں اضافہ ہو۔''

اور عبداللہ بن ہشام انصاری رقم طراز ہیں:

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

قد بلغني ان قوما من الجهلاء يجتمعون يوم عرفة بالمسجد، وان منهم من يطوف بالصخرة، وانهم ينفرون عند غروب الشمس، وكل ذلك ضلال واضغاث احلام.

''میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ عرفہ کے روز کچھ جاہل لوگ مسجد اقصیٰ میں جمع ہوتے ہیں، اور ان میں سے کچھ لوگ صخرہ کا طواف کرتے ہیں، اور غروب آفتاب کے وقت واپس چلے جاتے ہیں، حالانکہ یہ محض گمراہی اور اڑتے پھرتے پراگندہ خیالات ہیں۔''

(تحصیل الانس لزائر القدس، ح: ٦٤)

اور شیخ ناصر الدین الالبانی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

الفضيلة للمسجد الاقصى وليست للصخرة، وما ذكر فيها لا قيمة له من الناحية العلمية.

''فضیلت صرف مسجد اقصیٰ کی ہے، صخرہ کی نہیں۔ اور اس کے متعلق جو کچھ ذکر کیا جاتا ہے، اس کی علمی طور پر کوئی قیمت نہیں ہے۔''

اور سعودی عرب کی فتویٰ کمیٹی نے بھی لکھا ہے:

وليست صخرة بيت المقدس معلقة في الفضاء وحولها هواء من جميع نواحيها بل لا تزال متصلة من جانب بالجبل التى هى جزء منه متماسكة معه.

''بیت المقدس کا صخرہ فضا میں لٹکا ہوا ہرگز نہیں کہ اس کے اردگرد چاروں طرف ہوا ہی ہو، بلکہ وہ چٹان کے ساتھ ملا ہوا ہے جس کا وہ ایک حصہ ہے''

(فتاوی اللجنۃ الدائمہ: ۲۶/۱)

(فضیلت بین المقدس اور فلسطین وشام، ص ۵۴-۵۶)

۳۔ مسجد اقصیٰ کی تاریخ کے تحت ہم بتا چکے ہیں کہ ۷۰ء میں ہیکل سلیمانی کی تباہی میں اس کی صرف مغربی دیوار محفوظ رہ گئی تھی۔ اس مذہبی و تاریخی اہمیت کے پیش نظر اس دیوار کو یہود کے ہاں ایک مقدس و متبرک مقام کی حیثیت حاصل ہوگئی اور اس دیوار کی زیارت کے لیے آنے اور اس کے پاس دعا و مناجات اور گریہ وزاری نے رفتہ رفتہ ان کے ہاں ایک مذہبی رسم کی حیثیت اختیار کر لی۔ یہ حقیقت تاریخی لحاظ سے بالکل مسلم ہے اور مسلمانوں کے ادوار حکومت میں بھی یہودیوں کے اس حق کو کبھی چیلنج نہیں کیا گیا۔ تاہم انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں فلسطین میں بڑھتے ہوئے صہیونی اثر ونفوذ کے باعث یہودیوں نے سابقہ روایت سے ہٹ کر دیوار گریہ کے پاس اپنے مذہبی معمولات میں اضافہ کرنے اور اس پر قانونی ملکیت کا حق جتانے کی کوشش کی تو مسلمانوں اور یہودیوں کے مابین تنازعات پیدا ہونے لگے۔ ہم یہاں اس تنازع کے قانونی اور تاریخی پہلوؤں سے صرف نظر کرتے ہوئے محض اس دعوے کی اخلاقی حیثیت کو واضح کرنا چاہتے ہیں جس کو دہرانے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

میں مسلم میڈیا اور عرب سیاسی و مذہبی راہ نما یک زبان ہیں، یعنی یہ کہ مغربی دیوار دراصل وہ مقام ہے جس کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر معراج کے موقع پر اپنے جانور براق کو باندھا تھا، اس لیے یہ مسلمانوں کا ایک مقدس مقام ہے نہ کہ یہود کا۔ مفتی اعظم فلسطین عکرمہ صبری نے ۲۴ مارچ کو اطالوی اخبار La Republica کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا:

''بات بالکل صاف ہے: دیوار گریہ یہودیوں کا مقدس مقام نہیں ہے، یہ تو مسجد کا اٹوٹ انگ ہے۔ ہم اس کو دیوار براق کہتے ہیں، جو اس گھوڑے کا نام ہے جس پر سوار ہو کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم یروشلم سے آسمان پر تشریف لے گئے۔''

ایک اور بیان میں انھوں نے کہا:

''دیوار براق کے کسی ایک پتھر کا بھی یہودیت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہودیوں نے اس دیوار کے پاس انیسویں صدی میں دعا مانگنا شروع کی جب ان کے دلوں میں کئی آرزوئیں پروان چڑھنا شروع ہو گئی تھیں۔'' (کل العرب، ۱۸ اگست ۲۰۰۰ء)

۱۰ اکتوبر کو وائس آف فلسطین پر نشر ہونے والی ایک تقریر میں یاسر عرفات نے کہا:

''اس دیوار کا نام مقدس دیوار براق ہے نہ کہ دیوار گریہ۔ ہم اس کو دیوار گریہ نہیں کہتے۔ ۱۹۲۹ء میں اس مسئلے پر ہونے والے ہنگاموں کے بعد شا بین الاقوامی کمیٹی نے قرار دیا کہ یہ مسلمانوں کی ایک مقدس دیوار ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے براق کو باندھنے کا ذکر واقعہ اسرا کی روایات میں موجود ہے[۵۱] لیکن اس جگہ کی تعیین کا نہ کوئی قرینہ ہے اور نہ ابتدائی دور کے مسلم مورخین نے اس کی کوئی کوشش کی ہے۔ خود عہد صحابہ میں اس ضمن میں اختلاف موجود تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے براق کو باندھا بھی یا نہیں۔ سیدنا حذیفہ کی رائے یہ تھی کہ:

''لوگ کہتے ہیں کہ آپ نے اس جانور کو باندھ دیا۔ کیوں؟ کیا آپ کو یہ خدشہ تھا کہ وہ بھاگ جائے گا؟ اسے تو عالم الغیب والشہادۃ نے آپ کے لیے مسخر کیا تھا۔'' (ترمذی، رقم ۳۱۴۷۔ مسند احمد، رقم ۲۲۲۴۳)

بہت بعد میں جب مسجد اقصیٰ کے حوالے سے طرح طرح کے اوہام و تخیلات رواج پانا شروع ہوئے تو اس تناظر میں اس کے مختلف مقامات کی تعیین اور ان کے بارے میں تقدس کے تصورات پیدا کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ یہ سلسلہ تا حال جاری ہے اور دیوار گریہ کو 'دیوار براق' قرار دینے کی کوشش بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ بیسویں صدی سے قبل اس بنیاد پر اس دیوار کے تقدس کا کوئی تصور مسلمانوں کے ہاں نہیں پایا جاتا تھا کہ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے براق کو باندھا تھا، بلکہ سولھویں صدی عیسوی کے عثمانی خلیفہ سلطان سلیم کے بارے میں ثابت ہے کہ اس کے دور سے پہلے ''دیوار گریہ'' ملبے اور کوڑے کرکٹ میں دبی ہوئی تھی اور اس کا کوئی نشان تک لوگوں کو معلوم نہ تھا۔ سلطان سلیم کو اتفاقاً اس کے وجود کا علم ہوا تو اس نے اس جگہ کو صاف کرا کے یہودیوں کو اس کی زیارت کی اجازت عطا کی۔[۵۲]

۵۱؎ صحیح مسلم و مسند احمد عن انس، مسند البزار والترمذی عن بریدہ، دلائل النبوۃ للبیہقی عن ابی سعید۔ بحوالہ تفسیر ابن کثیر، ۳/ ۲۔۲۴۔

۵۲؎ ماہنامہ سیارہ لاہور، اشاعت خاص، نومبر ۲۰۰۱ء، ص ۳۷، ۳۸۔

۱۹۳۰ء میں برطانوی شاہی کمیشن کے سامنے جب فریقین نے اپنا اپنا موقف پیش کیا تو دیوار براق کے حوالے سے یہودیوں نے یہ الزام عائد کیا کہ:

''ہیکل میں داخل ہونے کے لیے محمد نے کون سا راستہ اختیار کیا، اس کا تعین کبھی نہیں کیا جا سکا اور یہ صرف حالیہ زمانے کی بات ہے کہ مسلمانوں نے یہ مشہور کرنا شروع کر دیا ہے کہ پیغمبر یہاں سے گزرے تھے اور انھوں نے اپنے پروں والے خچر کو اس دیوار میں لوہے کے ایک حلقے کے ساتھ باندھ دیا تھا جو اب مسجد براق کا ایک حصہ ہے۔ نیز حالیہ سالوں تک مسلمان اس دیوار کو دیوار براق بھی نہیں کہتے تھے۔ مسلم اہل حل وعقد نے ۱۹۱۴ء میں حرم کی جو سرکاری گائیڈ شائع کی، اس میں اس دیوار کے کسی خاص تقدس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔''

اس کے جواب میں مسلم نمائندے کوئی دلیل دینے کے بجائے صرف یہ دعویٰ دہرا کر رہ گئے کہ:

''اس دیوار اور اس کے سامنے موجود گزرگاہ کے تقدس کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ سفر معراج کے موقع پر پیغمبر اسلام کا پروں والا خچر براق یہاں آیا اور اس کو حرم کی مغربی دیوار کے ساتھ باندھا گیا۔''

مذکورہ بالا تمام امور کے حوالے سے امت مسلمہ کی پوزیشن علمی واخلاقی لحاظ سے ناقابل دفاع ہے۔ یہ روش صراحتاً علمی بد دیانتی اور مذہب کے نام پر لوگوں کے جذباتی استحصال کے زمرے میں آتی ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

خلاصہ بحث

ماسبق میں مسجد اقصیٰ کی تولیت وتصرف کے حق کے حوالے سے مختلف نقطہ ہائے نظر اور ان کے دلائل کی تنقید وتنقیح پر مبنی جو بحث ہم نے کی ہے، اس کا حاصل اہم نکات کی صورت میں درج ذیل ہے:

۱۔ قرآن مجید مسلمانوں کی مساجد کے ساتھ ساتھ اہل کتاب کی عبادت گاہوں کو بھی اللہ کی یاد کے لیے بنائے گئے گھر تسلیم کرتا اور ان کے احترام وتقدس کو ملحوظ رکھنے کی تلقین کرتا ہے۔ مسجد اقصیٰ کو علاوہ بریں یہ خصوصی امتیاز حاصل ہے کہ اس کی تعمیر ایک جلیل القدر پیغمبر کے ہاتھوں ہوئی اور اسے بنی اسرائیل کے سینکڑوں انبیائے کرام کے دعوتی وتبلیغی مرکز کی حیثیت حاصل رہی۔ اسلام چونکہ تمام انبیا کو ایک ہی سلسلہ رشد وہدایت سے منسلک مانتا، سب کی یکساں تعظیم وتکریم کی تعلیم دیتا اور سب کے آثار وباقیات کے احترام کی تلقین کرتا ہے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد اقصیٰ کا شمار روئے زمین کی تین افضل ترین مساجد میں کیا اور مسلمانوں کے لیے اس میں نماز پڑھنے کے لیے باقاعدہ سفر کر کے جانے کو مشروع قرار دیا۔

۲۔ فتح بیت المقدس کے بعد مسلمانوں نے اس نہایت مقدس اور فضیلت والی عبادت گاہ کو، جو صدیوں سے ویران پڑی ہوئی تھی، آباد اور تعمیر کیا۔ قرآن وسنت کی اصولی تعلیمات کی روشنی میں مسلمانوں کے اس اقدام کی نوعیت خالصتاً احترام وتقدیس اور تکریم وتعظیم کی تھی نہ کہ استحقاق اور استیثار کی۔ اس کی تولیت کی ذمہ داری انھوں نے یہود کو اس سے بے دخل کر کے اس پر اپنا حق جتانے کے تصور کے تحت نہیں بلکہ ان کی غیر موجودگی میں محض امانتاً اٹھائی تھی۔ لیکن چونکہ اس سارے عرصے

میں یہود کے نزدیک نہ مذہبی لحاظ سے ہیکل کی تعمیر نو کی شرائط پوری ہوتی تھیں اور نہ وہ سیاسی لحاظ سے اس پوزیشن میں تھے کہ اس کا مطالبہ یا کوشش کریں، اس لیے کم و بیش تیرہ صدیوں تک جاری رہنے والے اس تسلسل نے غیر محسوس طریقے سے مسجد اقصیٰ کے ساتھ مسلمانوں کی وابستگی اور اس پر استحقاق کا ایک ایسا تصور پیدا کر دیا جس کے نتیجے میں معاملے کا اصل پس منظر اور اس کی صحیح نوعیت نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔

۳۔ گزشتہ صدی میں جب یہود کے مذہبی حلقوں کی طرف سے یہ مطالبہ باقاعدہ صورت میں سامنے آیا تو وہ صہیونی تحریک کے سیاسی عزائم کے جلو میں آیا۔ امت مسلمہ کی اخلاقی ذمہ داری بلاشبہ یہ تھی کہ وہ سیاسی کشاکش سے بالاتر ہو کر اس مطالبے کو اس کے صحیح شرعی و مذہبی تناظر میں دیکھتی اور اسلام کی اصولی تعلیمات کی روشنی میں اس معاملے کا فیصلہ عدل وانصاف کے ساتھ بالکل بے لاگ طریقے سے کرتی۔ اہل کتاب اور ان کی عبادت گاہوں کے بارے میں اسلام کی اصل تعلیم رواداری اور مسامحت کی ہے۔ مرکز عبادت اور قبلہ کی حیثیت رکھنے والے مقام کے احترام اور اس کے ساتھ وابستگی کی جو کیفیت مذاہب عالم کے ماننے والوں میں پائی جاتی ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اسی طرح یہود کی شریعت میں ہیکل کے مقام وحیثیت، اس کی تباہی و بربادی پر ان کے دلوں میں ذلت و رسوائی کے احساسات اور اس کی بازیابی کے حوالے سے ان کے سینوں میں صدیوں سے تڑپنے والے مذہبی جذبات بھی ایک مسلمہ حقیقت ہیں۔ یہ ایک نہایت اعلیٰ، مبارک اور فطری جذبہ ہے اور خود قرآن مجید یہود سے ان کے اس مرکز عبادت کے چھن جانے کی وجہ ان کے اخلاقی جرائم کو قرار دینے کے ساتھ ساتھ اس امکان کو بھی صراحتاً تسلیم کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اور ان کی آزمائش کے لیے اس مرکز کو دوبارہ ان کے تصرف میں دے دے۔

۴۔ اس معاملے میں امت مسلمہ کے موقف اور رویے کا جس قدر بھی تجزیہ کیجیے، یہی بات نکھرتی چلی جاتی ہے کہ وہ 'استحقاق' کی نفسیات سے مغلوب ہوگئی ہے جس کے نتیجے میں مسجد اقصیٰ کی تولیت کی 'امانت' کو ایک مستقل مذہبی حق قرار دینے اور یہود کو اس سے قطعاً لاتعلق ثابت کرنے کے لیے علمی سطح پر انحرافات کا ایک سلسلہ وجود میں آ چکا ہے۔ ایک گروہ نے سرے سے مسجد اقصیٰ کی مسلم اور متواتر تاریخ کو ہی جھٹلا دیا۔ دوسرے گروہ نے تکوینی اور واقعاتی طور پر امت مسلمہ کو ملنے والے حق تولیت کو ایک ابدی اور ناقابل تبدیلی شرعی حق کا رنگ دینے کی کوشش کی۔ جبکہ تیسرے گروہ نے تیرہ صدیوں کے واقعاتی تسلسل کو ہی حتمی اور فیصلہ کن قرار دیتے ہوئے اس سلسلے میں دیگر قابل لحاظ امور کے ساتھ ساتھ مذہبی اخلاقیات اور قرآن وسنت کی اصولی تعلیمات کو بھی کوئی وزن دینے سے انکار کر دیا۔ ان علمی انحرافات کے نتیجے میں آج جذبات کی شدت اور احساسات کے تناؤ کا یہ عالم ہے کہ کوئی شخص اس مسئلے کی غیر جانبدارانہ علمی تحقیق کرنے کے لیے تیار نہیں۔

۵۔ اس صورت حال سے واضح ہے کہ مسجد اقصیٰ کا معاملہ امت مسلمہ کے لیے بھی اسی طرح ایک اخلاقی آزمائش (Test Case) کی حیثیت رکھتا ہے جس طرح کہ وہ بنی اسرائیل کے لیے تھا، اور افسوس ہے کہ اس آزمائش میں ہمارا رویہ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

بھی حذو النعل بالنعل اپنے پیش رووں کے طرز عمل ہی کے مماثل ہے۔ ارض فلسطین پر حق کا مسئلہ موجودہ تناظر میں اصلاً ایک سیاسی مسئلہ تھا اس لیے اس کی وضع موجود میں یہود کے پیدا کردہ تغیر حالات پر اگر عرب اقوام اور امت مسلمہ میں مخالفانہ ردعمل پیدا ہوا تو وہ ایک قابل فہم اور فطری بات تھی، لیکن ہیکل کی بازیابی اور تعمیر نو کے ایک مقدس مذہبی جذبے کو ''مسجد اقصیٰ کی حرمت کی پامالی کی یہودی سازش'' کا عنوان دے کر ایک طعنہ اور الزام بنا دینا، مسجد اقصیٰ پر یہود کے تاریخی و مذہبی حق کی مطلقاً نفی کر دینا اور، اس سے بڑھ کر، ان کو اس میں عبادت تک کی اجازت نہ دینا ہرگز کوئی ایسا طرز عمل نہیں ہے جو کسی طرح بھی قرین انصاف اور اس امت کے شایان شان ہو جس کو قوامین للہ شہداء بالقسط کے منصب پر فائز کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس امت کو اپنا فرض منصبی پہچاننے، اس کے تقاضوں کو بے کم و کاست پورا کرنے اور اس باب کے تمام انحرافات سے رجوع کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ اللّٰھم اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم و لا الضالین۔ آمین۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ریحان احمد یوسفی

عروج وزوال کا قانون ـــــ تاریخ کی روشنی میں

(۶)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

عیسائیت کی حیثیت

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ سیدنا مسیح اصلاً بنی اسرائیل کی طرف ہی مبعوث کیے گئے تھے (آل عمران ۳: ۴۹)۔ مگران لوگوں کی اکثریت نے آنجناب کا انکار کردیا۔ تاہم بنی اسرائیل کا ایک گروہ آپ پر ایمان لے آیا۔ قرآن نے تصریح کی ہے کہ یہی لوگ آخر کار غالب ہوئے (الصّف ۶۱: ۱۴)۔ یہی وہ لوگ تھے جن کے زیر اثر عیسائیت سینٹ پال کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں کے باوجود توحید پر قائم رہی۔ انھی لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک توحید کا علم سنبھالے رکھا۔ تاہم اس دوران میں گمراہ کن عیسائی فرقوں کے نظریات فروغ پاتے رہے اور سلطنت روما کی شکل میں انھیں اقتدار کا تحفظ بھی حاصل ہوگیا۔ دوسری طرف یہ موحدین عیسائی چھ صدیوں تک توحید کی خدمت سرانجام دینے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد ملت اسلامیہ میں جذب ہوگئے۔ اس کے بعد جو عیسائیت بچی اس کا نام کے سوا سیدنا مسیح سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

بنی اسماعیل کی تاریخ

بنی اسرائیل کی طرح بنی اسماعیل کا آغاز بھی ہدایت ربانی کی روشنی میں ہوا تھا۔ ان کے جد امجد یعنی حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل، دونوں جلیل القدر نبی تھے۔ ان کا ایک اضافی اعزاز یہ تھا کہ انھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر بیت اللہ کے پاس بسایا تھا۔ تاہم بنی اسرائیل کے برعکس ان کے درمیان نبی نہیں بھیجے گئے اور انھیں فطرت کے ماحول میں تقریباً دو

ہزار برس تک پروان چڑھا کر ایک قوم بنا دیا گیا۔ان کی حیثیت آج کی زبان میں بیک اپ (Back up) کی سی تھی۔یعنی جب بنی اسرائیل اپنے منصب کو ادا کرنے میں مکمل طور پر ناکام ہو جائیں تو انھیں معزول کر کے امامت عالم کا منصب بنی اسماعیل کی طرف منتقل کیا جائے گا۔جس طرح حضرت موسیٰ کو بنی اسرائیل میں مبعوث کر کے اللہ تعالیٰ نے ان سے عہد لیا تھا اسی طرح بنی اسماعیل میں اللہ تعالیٰ نے اپنا آخری رسول اور نبی مبعوث کیا تاکہ اب یہ عہد ان سے باندھا جا سکے۔حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حیثیت کہ وہ حضرت موسیٰ کی مانند ہیں، بائیبل اور قرآن دونوں میں بیان ہوئی ہے (استثنا ۱۸: ۱۵۔۱۸، المزمل ۷۳: ۱۵)۔

چنانچہ رفع مسیح کے تقریباً چھ صدیوں بعد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بنی اسماعیل کی طرف مبعوث کیا گیا۔آپ نے عرب کی قیادت یعنی قریش کے سامنے دین حق کی دعوت رکھی۔قریش کی قیادت نے آپ کی دعوت رد کر دی۔آپ چونکہ ایک رسول بھی تھے، اس لیے آپ کے مخالفین پر اس قانون کا اطلاق ہو گیا جو ہم نے رسولوں کے ضمن میں اوپر بیان کیا ہے۔یعنی اتمام حجت کے بعد آپ کے مخالفین کو موت کی سزا سنا دی گئی۔جنگ بدر میں قریش کی قیادت کو چن چن کر ختم کر دیا گیا۔اس کے بعد سات برس کی مختصر مدت میں پورے عرب پر آپ کا اقتدار قائم ہو گیا۔تمام بنی اسماعیل آپ پر ایمان لے آئے۔اسی دوران میں ان سے شریعت کا وہ عہد و پیمان لیا گیا جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے آخری درجہ میں اس عہد کو پورا کیا جس کے نتیجے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور تک پوری متمدن دنیا کا اقتدار انھیں سونپ دیا گیا۔یہی وہ دور ہے جس میں بنی اسماعیل نے اپنی فتوحات کے ذریعے سے مشرکانہ اقتدار کو بالجبر مٹا ڈالا اور انسانیت کے سامنے ایک حقیقی توحید پرستانہ معاشرہ کا نقشہ قائم کر دیا۔

اس کے بعد کم و بیش اگلے ہزار سال اس نشیب و فراز کی داستان ہیں جو کہ بنی اسماعیل کی تاریخ میں آتے رہے۔انھوں نے جب کبھی اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں کوتاہی کی تو انھیں سخت سزا دی گئی اور جب جب خدا کی فرماں برداری کی روش اختیار کی تو خدا کی رحمت فوراً ان کی طرف متوجہ ہوئی۔انھیں عزت اقوامِ عالم پر غلبہ و اقتدار کی شکل میں دی گئی اور عذاب باہمی جنگوں اور بیرونی حملہ آوروں کی شکل میں دیا گیا۔

اوپر ہم بیان کر چکے ہیں کہ سیدنا ابراہیم کو جو مقام و مرتبہ ملا وہ آزمایش سے گزر کر ملا اور یہی آزمایش کا سلسلہ ان کی اولاد میں رکھ دیا گیا۔بنی اسماعیل کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ابتدائی نسلوں میں توحید و شریعت سے وابستگی کے معاملے میں ان سے کوتاہی نہیں ہوئی، البتہ اقتدار کا معاملہ ان کے لیے زبردست آزمایش بن گیا۔بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ خدا کی منشا بھی یہی تھی۔اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جانشین کی صراحت کیے بغیر دنیا سے رخصت ہوئے۔پہلی دفعہ جب یہ آزمایش سقیفہ بنی ساعدہ میں سامنے آئی تو صحابۂ کرام کی اکثریت ہونے کی بنا پر بنی اسماعیل بڑی کامیابی سے اس آزمایش سے سرخ رو ہو گئے۔اس کا نتیجہ خدا کی غیر معمولی نصرت کی شکل میں نکلا اور پوری متمدن دنیا پر بنی اسماعیل کا اقتدار قائم ہو گیا۔تاہم اس

www.javedahmadghamidi.org / www.al-mawrid.org

کے بعد صحابۂ کرام کی تعداد کم ہوتی چلی گئی۔ اور پھر جو ہوا وہ تاریخ کی ایک معلوم داستان ہے۔ اس کا نتیجہ بھی ایک معلوم حقیقت ہے۔ جب کبھی اس معاملے میں بنی اسماعیل نے درست رویہ اختیار کیا تو وہ آندھی طوفان کی طرح دنیا پر چھاتے چلے گئے اور جب کبھی انحراف کیا تو نہ صرف ان کی بیرونی یلغار رکی، بلکہ ایک دوسرے کی تلواروں کا ذائقہ بھی انھیں چکھنا پڑا۔ اختصار کے پیش نظر ہم اس سلسلے کے نشیب و فراز کا اشارہ دینے پر ہی اکتفا کریں گے۔ ان کی تفصیل بالعموم لوگوں کو معلوم ہے۔ شہادتِ عثمان اور خلافتِ راشدہ کے آخری ایام میں باہمی جنگ و جدل کا نشیب، سیدنا حسن رضی اللہ عنہ (اس نام میں دو نقطے غلطی سے نہیں چھوٹے) کی عظیم قربانی کے بعد بنی اسماعیل کا عروج، یزید کی جانشینی کے بعد پھر خلفشار، عبدالملک کے بعد کا استحکام اور عمر بن عبدالعزیز کے دور میں خلافتِ راشدہ کا احیا، یہ سب اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کو محض ڈھائی سال کے اندر زہر دے کر اقتدار سے ہٹا دیا گیا۔ یہ بنی امیہ کا ایسا جرم تھا جس کے جواب میں خداوند بنی اسماعیل کے خدا نے ان پر عذاب کا کوڑا برسا دیا۔ آپ کے بعد بنوامیہ انتہائی مردم خیز ہونے کے باوجود کوئی بڑی فتح حاصل نہ کر سکے۔ پھر تھوڑے ہی عرصہ میں جس طرح بنوامیہ کو بنوعباس نے ان کے عین عروج میں اقتدار سے ہٹایا ہے، وہ تاریخ کا انتہائی غیر معمولی واقعہ ہے۔ ہم سیاسی قیادت کے ضمن میں اس کی کچھ تفصیل پچھلے باب میں بیان کر چکے ہیں۔ بنوامیہ کے ایک ایک فرد کو چن چن کر ہلاک کر دیا گیا سوائے ایک اموی شہزادہ عبدالرحمٰن کے جس کے ذریعے سے خدا نے بنوامیہ کو ایک موقع پھر عنایت کیا کہ وہ بنواسماعیل کے سلسلۂ اقتدار کو مغرب میں پھیلائیں۔

دوسری صدی ہجری کے آغاز میں صورت حال یہ ہو چکی تھی کہ بنی اسماعیل کی ایک شاخ بنوامیہ اندلس میں حکمران تھی اور بقیہ عالم اسلام میں ان کی دوسری شاخ بنوعباس کا سکہ چل رہا تھا۔ ہارون الرشید کے دور تک بنوعباس کے اقتدار کا سورج نصف النہار کو چھو رہا تھا اور قیصر روم کی حیثیت خلیفہ کے باج گزار کی تھی۔ دوسری طرف بنوامیہ کے عبدالرحمٰن کے دور تک جنوبی یورپ کی تمام عیسائی ریاستیں اپنے وجود کے لیے بنوامیہ کے نظر کرم کی محتاج تھیں۔ تاہم حدیث کے الفاظ میں جسے خیر القرون کہا گیا تھا، وہ دور اب ختم ہونے لگا تھا۔ شریعت کی پاس داری اب ماضی کا قصہ بننے لگی اور توحید کے فروغ کے بجائے، یونانی افکار کے زیر اثر، لایعنی مباحث اسلامی معاشرے کا موضوع سخن بن گئے۔ اسی دور میں خلقِ قرآن کا فتنہ پیدا ہوا۔ مامون اور معتصم کے دور میں امام احمد بن حنبل کو بے پناہ سختیاں جھیلنی پڑیں۔ رفتہ رفتہ صورت حال مزید خراب ہوئی۔ شریعت کی حقیقی پاس داری کی جگہ ظاہر پرستی اور توحید و آخرت کی جگہ دنیا پرستی نے لے لی۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا سے ان کا رعب و وقار رخصت ہونا شروع ہو گیا۔ خلافت کی توسیع تو دور کی بات ہے خود بنوعباس دوسروں کی بیساکھیوں کے سہارے حکومت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ انھیں آخری سزا دینے سے قبل دو دفعہ تنبیہ کی گئی۔ پہلے مغربی صلیبی حملہ آوروں کے ذریعے شام و فلسطین کی تباہی کے ذریعے سے اور پھر مشرق سے تاتاریوں کے ہاتھوں خوارزم شاہ کی حکومت کی تباہی سے۔ انھوں نے دونوں کو نظر انداز کر دیا۔ آخر کار جب ان کے رویے میں اصلاح کا کوئی عنصر باقی نہ رہا تو خدائی عذاب ہلاکو خان کی شکل میں

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

ان کی طرف متوجہ ہوا۔ بغداد میں آخری خلیفہ مستعصم کے ساتھ جو معاملہ ہوا، وہ خدا کی بے لاگ سنت کا اظہار تھا۔

دوسری طرف بنی اسماعیل کی دوسری شاخ بنو امیہ نے بھی جب یہی رویہ اختیار کیا تو عیسائیوں کے ذریعے سے ان پر ویسا ہی عذابِ استیصال آیا۔ اور اندلس سے ان کا نام و نشان تک مٹا دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی آل ابراہیم کے بارے میں خدا کا قانون فیصلہ کن طور پر نافذ ہوا۔

آل ابراہیم کو لگنے والے امراض

یہ بحث اس وقت تک مکمل نہ ہوگی جب تک کہ اس بات کی وضاحت نہ ہو جائے کہ کیا وجہ تھی کہ بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل اپنی ذمہ داریوں کو کما حقہ ادا نہ کرسکے۔ وہ کون سے امراض تھے جن کا لاحق ہونا امت مسلمہ کے لیے موت کا پیغام ثابت ہوتا ہے۔ تاہم اس سے قبل یہ واضح کرنا مناسب ہوگا کہ ہم آل براہیم اور امت مسلمہ کو متبادل اصطلاحات کے طور پر کیوں بیان کر رہے ہیں۔ اصل میں خدا کا عہد تو آل ابراہیم کے ساتھ ہی تھا، مگر ان کے ساتھ دوسرے لوگ بھی شامل ہو گئے۔ اور یہی مطلوب بھی تھا کہ یہ لوگ حق کی شمع جلائیں اور دوسری اقوام ان سے فیض پائیں۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے ساتھ جن ''پردیسی'' لوگوں کا ذکر بائیبل میں ملتا ہے ، یہ وہی دوسری اقوام کے لوگ تھے۔ اور بنی اسماعیل جو عربوں کے نام سے معروف تھے، ان کے ساتھ عجمی مسلمان اسی حیثیت میں شامل تھے۔ یہ سب مل کر امت مسلمہ بناتے ہیں، مگر بغداد کی تباہی تک امت مسلمہ کی امامت و قیادت آل ابراہیم کے ہاتھ میں رہی۔ اسی لیے ہم ان دونوں کو متبادل اصطلاحات کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔

جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں امت مسلمہ کی اساس اصلاً دو چیزوں پر ہوتی ہے۔ ایک توحید سے وفاداری اور دوسری شریعت کی پاس داری۔ ہر وہ بیماری جو ان دو وظیفوں کی راہ میں رکاوٹ بنے امت مسلمہ کے لیے تباہی کا پیغام لاتی ہے۔ قرآن و تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کو لگنے والا پہلا مرض جس نے انھیں بار بار توحید سے دور کیا، وہ شرک تھا۔ اس دور کی بین الاقوامی تہذیب میں شرک جس طرح داخل تھا اور بالخصوص مصریوں کی غلامی میں رہنے کے بعد ان کے اذہان پر اس کے کتنے اثرات تھے، اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ انھوں نے مصر سے نکلتے ہی حضرت موسیٰ سے ایک خدا بنانے کی فرمایش کی (الاعراف ۷: ۱۳۸)۔ آپ کے طور پر جانے کے بعد بچھڑے کو خدا بنا بیٹھے (الاعراف ۷: ۱۴۸)، قرآن کے الفاظ میں ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت پلا دی گئی (البقرہ ۲: ۹۳)۔ شرک کے ان اثرات نے فلسطین میں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا اور انبیائے بنی اسرائیل نے اس معاملے میں جس طرح انھیں شدید تنبیہ کی ہے، وہ بائبل میں جگہ جگہ دیکھی جا سکتی ہے۔

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ توحید کے فروغ کے جس مشن پر وہ مامور تھے، انھوں نے بار بار اس سے روگردانی اختیار

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کی۔ ایک دوسرا مرض جوان کولاحق ہوااور جوان کی تاریخ کے آخری دور میں شرک سے بھی زیادہ بڑھ گیا، وہ ظاہر پرستی کا تھا۔ اس نے انھیں شریعت کی پاس داری کی عظیم ذمہ داری کو پورا کرنے کے قابل نہ چھوڑا۔ وہ شریعت اوراس کے مصالح کو چھوڑ کر فقہ کے ظاہری سانچے کے اسیر ہوگئے۔ قرآن ان کے اس فقہی سانچے کو بوجھ اور بیڑیوں سے تعبیر کرتا ہے (الاعراف ۷: ۱۵۷)۔ اس صورت حال کو اگر درست طور پر سمجھنا ہے تو اس کے لیے انجیل کا مطالعہ بے حد مفید ہوگا۔ فقیہوں اور فریسیوں نے شریعت کے نام پر جو صورت حال پیدا کر دی تھی سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے اس پر شاہکار تنقید کی ہے۔ تاہم یہودی علما اپنی اصلاح کے بجائے ان کے دشمن بن گئے اوران کی جان کے درپے ہوگئے۔

کچھ ایسی ہی صورت حال بنی اسماعیل اور دیگر مسلمان اقوام کے ساتھ پیش آئی۔ شرک کے خلاف قرآن کا مورچہ اتنا مستحکم تھا کہ بنی اسماعیل میں وہ بآسانی داخل نہ ہوسکا۔ تاہم اکابر پرستی کا مرض جس میں مبتلا ہو کر عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا قرار دے دیا تھا، اس امت میں بھی خوب پھیلا۔ دورِ جدید میں شرک کی جگہ اب الحاد (atheism) نے لے لی ہے۔ موجودہ دور میں الحاد وہ رویہ بن گیا ہے جس میں براہِ راست خدا کا انکار نہ بھی کیا جائے تب بھی اپنی خواہشات کو معبود اور دنیا کی زندگی کو نصب العین بنا کر جیا جاتا ہے۔ یہ رویہ اس امت میں بڑا عام رہا ہے۔ قرآن اس رویہ کو اس طرح بیان کرتا ہے:

> ''کیا تم نے دیکھا اس شخص کو جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے۔ اور جس کو اللہ نے، علم رکھتے ہوئے، گمراہ کر دیا اور اس کے کان اوراس کے دل پر مہر کر دی۔ اوراس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا؟ بھلا ایسوں کو کون ہدایت دے سکتا ہے، بعد اس کے کہ اللہ نے (اس کو گمراہ کر دیا ہو)؟ کیا تم لوگ دھیان نہیں کرتے؟ اور وہ کہتے ہیں کہ ہماری زندگی تو اسی دنیا کی زندگی تک ہے۔ (یہیں) ہم مرتے اور جیتے ہیں اور ہم کو بس گردشِ روزگار ہلاک کرتی ہے۔ اوران کو اس باب میں کوئی علم نہیں ہے، محض اٹکل کے تیر تکے چلا رہے ہیں۔'' (الجاثیہ ۴۵: ۲۳۔۲۴)

دنیا پرستی کی یہی وہ فکر ہے جس کی قرآن و حدیث میں سختی سے مذمت کی گئی ہے۔ کیونکہ یہ سوچ شرک کی طرح انسان کو توحید سے کاٹ دیتی ہے۔ اس میں مبتلا ہونے کے بعد ایک مسلمان توحید وآخرت، دونوں کے تقاضے بھول جاتا ہے۔

ظاہر پرستی کا مرض اس امت میں بنی اسرائیل کی طرح پوری شدت سے ظاہر ہوا۔ فقہ کا فن ایک بنیادی انسانی ضرورت تھا۔ یہ ضرورت ابتدائی صدیوں میں اسلامی اقتدار کے غلبے کے ساتھ ہی تیزی سے نمودار ہوئی۔ مگر تھوڑے عرصے میں ہی شریعت اوراس کے احکام کی روح فقہی انبار کے نیچے ایسی دبی کہ آج ہزار سال بعد کسی کو یہ سمجھانا بہت مشکل ہے کہ خدا کی بھیجی ہوئی مقدس شریعت، جو خدا کے عہد و میثاق کی بنیاد ہے، فقہ سے بلند تر چیز ہے۔ لوگ فقہ کے انسانی کام اور مقدس شریعت میں جب فرق نہیں کرتے تو یہ بات وہ کیسے مان لیں کہ فقہی کام حالات سے متعلق ہوتا ہے اور شریعت مقدس اور غیر متبدل ہے۔ آہستہ آہستہ اس کے نتیجے میں شریعت، اس کی روح اور اخلاقی اصول تو دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں اور فقہی موشگافیاں عین مطلوب بن جاتی ہے۔ غالباً ایسی ہی صورت حال میں سیدنا مسیح نے یہ کہا ہوگا کہ تم لوگ مچھروں کو چھانتے ہو اور اونٹوں کو

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

نگل جاتے ہو (متی ۲۳: ۲۴)۔

شرک والحاد، اکابر پرستی وحب دنیا اور ظاہر پرستی ہی وہ امراض ہیں جو جب کبھی امت مسلمہ کو لاحق ہوتے ہیں، اسے ان فرائض کی ادائیگی سے روک دیتے ہیں جن کے لیے اس کی تشکیل کی گئی ہے۔ یعنی توحید سے وفاداری اور شریعت کی پاس داری۔

آل ابراہیم کے بعد امت مسلمہ کی ذمہ داری

ہم نے اوپر امت مسلمہ کی تاسیس کے پس منظر میں یہ واضح کیا ہے کہ آل ابراہیم کی ذمہ داری دہری تھی۔ ایک یہ کہ شرک کو بالجبر ختم کرنا تاکہ لوگ حق کے ردوقبول کا فیصلہ آزادانہ بنیادوں پر کرسکیں۔ دوسرے الہامی شریعت کی بنیاد پر ایک خدا پرستانہ معاشرے کا قیام تاکہ حق کی شمع لوگوں کی ہدایت کے لیے ہمیشہ روشن رہے۔ یہ دوسری ذمہ داری غیر مشروط اور ہر حال میں مطلوب تھی، جبکہ پہلی صرف نبیوں اور رسولوں کی رہنمائی میں ہی سرانجام دی گئی۔ جنھوں نے یا تو خود اس کام کو خدا کی نگرانی میں سرانجام دیا یا باصراحت اپنی امتوں کو یہ بتایا کہ انھیں کن علاقوں میں شرک کو بالجبر ختم کرنا ہے۔۔ چنانچہ بائیبل میں فلسطین کے علاقہ کو بنی اسرائیل کا میدان عمل قرار دیا گیا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف بادشاہوں کو خطوط لکھ کر صحابۂ کرام (بنی اسماعیل) کا میدان عمل طے کیا تھا۔ موجودہ دور میں مشرق وسطیٰ اور اس کے قریبی علاقے ہی وہ جگہیں ہیں جو صحابۂ کرام کا میدان عمل تھیں اور جنھیں خلافت راشدہ میں فتح کر لیا گیا تھا۔ تاہم ختم نبوت ورسالت کے بعد شرک کو بالجبر دنیا سے مٹانے کا معاملہ بھی ختم ہوگیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ذمہ داری صحابۂ کرام کو سونپی تھی جنھوں نے ہمیشہ کے لیے شرک کو اقتدار سے جدا کر دیا۔ صحابۂ کرام کے بعد بھی بنی اسماعیل امت مسلمہ کی امامت کے منصب پر فائز رہے۔ بغداد واسپین کے ساتھ یہ معاملہ بھی اپنے انجام کو پہنچ گیا اور بنی اسرائیل کی طرح بنی اسماعیل بھی آخر کار منصب امامت سے معزول کر دیے گئے۔ یوں تقریباً تین ہزار سال تک جاری آل ابراہیم کی امامت کا یہ دور ختم ہوگیا۔

تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کل عالم کے لیے ہے اور آپ کی شریعت قیامت تک کے لیے آخری شریعت ہے، اس لیے بہرحال اس کے وارث بنی اسماعیل کے خاتمہ کے بعد بھی باقی رہے۔ اسی طرح امت مسلمہ پر ایک خدا پرستانہ معاشرے کے قیام کی غیر مشروط ذمہ داری بھی اپنی جگہ پورے طور پر باقی ہے۔ جہاں تک امت مسلمہ کی امامت کا تعلق ہے تو آل براہیم کے بعد اس کا انحصار اس عہد و پیمان پر ہے جو کوئی قوم خود آگے بڑھ کر خدا سے باندھ لے۔ بنی اسماعیل کے بعد اب تک دو قوموں نے آگے بڑھ کر یہ عہد باندھا ہے۔ پہلی قوم ترک تھی۔ سلطان سلیم نے سن ۱۵۱۷ء میں مصر فتح کیا اور رسمی طور پر خلافت کا بار اپنے سر پر لے لیا۔ جس کے بعد وہ سیاسی اور روحانی طور پر امت مسلمہ کے امام قرار پائے۔ یہ ان کا عہد تھا جو انھوں نے خدا سے باندھ لیا تھا۔ جب تک انھوں نے اس کا حق ادا کیا عروج ان کا مقدر رہا اور جب کوتاہی کی تو زوال کی کھائی

میں انھیں گرنا پڑا۔کئی صدیوں تک یہ بار اٹھانے کے بعد کمال اتاترک کی قیادت میں ترکوں نے خلافت کا خاتمہ کر کے اس عہد کو رسمی طور پر ختم کر دیا۔

جس وقت ترکی میں اتاترک اسلام اور خلافت کو دیس نکالا دے رہے تھے، ہزاروں میل کے فاصلے پر واقع ہندوستان میں امت مسلمہ کا ایک غلام گروہ، خلافت کی بقا کے لیے اپنے انگریز آقاؤں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ایسی جنگ کے لیے جس میں انھیں کچھ نہیں ملنا تھا، ان لوگوں نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔خلافت ختم ہوگئی۔ان لوگوں کے ہاتھ عالم اسباب میں کچھ نہ آیا۔مگر شاید ان کی بے پناہ قربانیوں کا اثر تھا کہ یہ قوم خدا کی نگاہ میں آ گئی۔

آنے والے سالوں میں حیرت انگیز طور پر حالات اس قوم کے سیاسی اقتدار کے حق میں ہموار ہوتے چلے گئے...جب اس قوم کی فکری و سیاسی قیادت، عوام الناس اور بڑی حد تک مذہبی قیادت نے یک سو ہوکر خدا سے یہ عہد کیا کہ اگر وہ انھیں زمین میں اقتدار دے گا تو وہ اسلام کا بہترین نمونہ دنیا کے سامنے پیش کریں گے۔یہ کم وبیش وہی صورت حال تھی جسے قرآن بنی اسماعیل کے حوالے سے یوں بیان کرتا ہے:

''یہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو سرزمین میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز کا اہتمام کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے۔'' (الحج ۲۲:۴۱)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اہل پاکستان کا معاملہ بھی یہی ہوگیا۔صرف اس فرق کے ساتھ کہ اس دفعہ یہ بات خدا کی طرف سے نہیں کہی گئی، بلکہ لوگ آگے بڑھے اور خدا سے یہ عہد کرلیا۔خدا نے ان کے قائدین کی درخواست منظور کر کے راہ کی ہر مشکل کو آسان کیا اور یوں دنیا کی سب سے بڑی مسلم حکومت اور پانچویں عظیم سلطنت کے طور پر پاکستان دنیا کے نقشے پر ظاہر ہوا۔اس طرح اہل پاکستان حضرت موسیٰ کی اس تنبیہ کا مصداق بن گئے جو انھوں نے اپنی غلام قوم یعنی بنی اسرائیل سے کہی تھی:

''امید ہے کہ تمھارا رب تمہارے دشمن کو پامال کرے گا اور تم کو ملک کا وارث بنائے گا کہ دیکھے تم کیا روش اختیار کرتے ہو۔'' (الاعراف ۷:۱۲۹)

اگلے باب میں اسی قوم کے حالات وتاریخ کا ایک تجزیاتی مطالعہ، عروج وزوال کے قوانین کی روشنی میں، ہمارے پیش نظر ہے۔

[باقی]

دعوتی کام ـــــــ تین پہلو

ہمارے معاشرے میں اصلاح ودعوت کا کام کرنے والے لوگ بالعموم مردوں ہی کواور مردوں کے بھی صرف ذہنوں کو پیش نظر رکھ کراپنا لائحۂ عمل ترتیب دیتے ہیں۔ وہ پورے انسان اور پورے معاشرے پر کام نہیں کررہے۔اس میں ہوسکتا ہے کہ وسائل کی کمی کی وجہ سے انھوں نے اپنا کام محدود رکھا ہواور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کی اس مسئلے کی طرف توجہ نہ ہوئی ہو۔ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ہمارے مصلحین اپنے کاموں میں حسب ذیل تین پہلوؤں کوبھی پیش نظر رکھیں تو امید ہے کہ ان کے اثرات و ثمرات پورے انسان اور پورے معاشرے میں پھیلنا شروع ہو جائیں گے۔

ا۔ایک اچھا مصلح حال میں مستقبل دیکھتا ہے،اسی لیے وہ بچوں کو بے حد اہمیت دیتا ہے۔اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ہی کل ملک وقوم کی باگ ڈور سنبھالنی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بچوں سے بہت محبت فرمایا کرتے تھے۔کہیں بچوں کے ساتھ آمنا سامنا ہوجاتا تو سلام کرنے میں پہل کرتے تھے۔بچوں سے اس قدر محبت فرماتے کہ اگر کوئی بچہ نماز میں سجدے کی حالت میں آپ کی کمر پر سوار ہوجاتا تو آپ اس وقت تک نہ اٹھتے جب تک وہ بچہ خود نہ ہٹ جاتا۔آپ نے فرمایا ہے کہ کسی باپ نے اپنے بیٹے کوعمدہ اور بہترین ادب سے بڑھ کر کوئی تحفہ نہیں دیا۔

بچوں پر تعلیم وتربیت کا کام کرنا اس پہلو سے بڑا آسان ہوتا ہے کہ انھیں تعلیم حاصل کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ان کے اندر تعصّبات، مفادات اور انا کے مسائل نہیں ہوتے۔ان کی فطرت ابھی مسخ نہیں ہوئی ہوتی۔ان کے ذہن پر کسی فرقے یا مسلک کی چھاپ نہیں ہوتی۔ان کا ذہن کورے کاغذ کی طرح ہوتا ہے۔اس پر جو کچھ لکھنے کی کوشش کی جائے، وہ جلد اور آسانی کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔اوراس ''تحریر'' کا عرصۂ حیات بھی بہت طویل ہوتا ہے۔ان کے اوپر بڑی ذمہ داریاں نہیں ہوتیں، اس لیے ان کے پاس وقت بھی بہت ہوتا ہے۔غرض یہ کہ ان پر کم وقت صرف کر کے نسبۃً زیادہ نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

۲۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ خواتین کو نظر انداز کر کے معاشرے میں اصلاح وتغیر کا کام نتیجہ خیز نہیں بنایا جاسکتا۔ عورتوں کی اسی اہمیت کے پیش نظر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ذہین اور دانا خاتون سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا تاکہ

وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلیم پا کر عورتوں کی تعلیم و تربیت کریں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کو خاص اہمیت دیتے تھے۔ انھیں ایام میں بھی مسجد میں آنے کی ہدایت فرماتے تھے۔ مسجد میں ان کے پاس جا کر خصوصی وعظ فرمایا کرتے تھے۔

مگر ہمارے ہاں اس حقیقت کا احساس نہ مردوں کو ہے اور نہ خود عورتوں کو۔ اس بات کو پورے شعور کے ساتھ مان لینا چاہیے کہ قوم عورتوں کے ہاتھوں میں ہے۔ نسلوں کی ذہنی اور اخلاقی افزایش انھوں نے کرنی ہے۔ بچے ان کی نگرانی میں رہتے ہیں۔ بچوں کو ہمیشہ ماؤں سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔ وہ ان کی شخصیت پر زیادہ اثر انداز ہونے کی صلاحیت اور مواقع رکھتی ہیں۔ چنانچہ ماں بے شعور ہو گی تو بچے بھی بے شعور ہوں گے۔ ماں دیدۂ بینا کی حامل ہو گی تو بچے کے اندر بھی بصیرت کی آنکھ کھل جائے گی۔ یہ عورتیں ہی ہیں جنھوں نے آیندہ نسلوں کو راہ دکھانی ہے، یہ عورتیں ہی ہیں جن کے پاس امراض معاشرت کی دوا ہے۔

مقام سے ہو اگر اپنے بہرہ ور عورت
معاشرے کو بھی لے آئے راہ پر عورت

اس معاملے میں مردوں کا بھی شعور بیدار کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ عورتوں کو غیر معقول رواجوں اور قاعدوں کی جکڑ بندیوں سے آزاد کریں، جو ان کی ذہنی، علمی اور اخلاقی ترقی کی راہ میں سنگ گراں بن چکی ہیں۔

۳۔ ہر انسان کی شخصیت کے بناؤ اور بگاڑ میں اس کا ماحول غیر معمولی کردار ادا کرتا ہے۔ قرآن مجید نے بھی ہمیں اپنی اصلاح کے لیے صادق الایمان افراد کی صحبت اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ یہ ایک مسلمہ ہے کہ کتاب، لٹریچر، لیکچر، ورکشاپ اور معلم سے انسان کو تعلیم ملتی ہے، اللہ کی کتابیں بھی اسی لیے نازل ہوئیں کہ انسان حق و باطل میں امتیاز کر سکے، مگر انسان کی تربیت ماحول کرتا ہے۔

آج بگڑے ہوئے ماحول میں دین کی کوئی بات کسی کے ذہن میں پہنچتی بھی ہے تو ماحول کی کشش اسے اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ اس کے ایک کان میں اللہ اکبر کی آواز پڑتی ہے تو دوسرے کان میں کیبل کے کسی چینل کی پکار پہنچ جاتی ہے اور اکثر و بیشتر یہ پکار زیادہ موثر ثابت ہوتی ہے۔ دین کے کسی موضوع پر کوئی کتاب پڑھنے اور دینی ماحول میں وقت گزارنے میں وہی فرق ہے جو ریڈیو پر ہاکی میچ کی کمنٹری سننے اور اسٹیڈیم میں میچ دیکھنے میں ہے۔ اس قسم کی تربیت میں مخاطب کو براہ راست دعوت دی جاتی ہے۔ اس سے دعوت بہت موثر ہو جاتی ہے۔ اس میں داعی مخاطب کی ذہنی سطح، الجھن اور موڈ دیکھ کر اپنی بات بدل سکتا ہے۔ ایک اسلوب یا مثال سے بات واضح نہ ہو تو دوسرا اسلوب اختیار کر سکتا ہے یا کوئی اور مثال دے سکتا ہے۔ پھر اس سے مخاطب سے ایک ذاتی نوعیت کا تعلق بھی قائم ہو جاتا ہے جس کے اپنے اثرات و ثمرات ہیں۔ لٹریچر کو پڑھ کر لوگ اپنی سمجھ کے مطابق مطلب نکال لیتے ہیں جو غلط بھی ہو سکتا ہے، مگر ذاتی ملاقات میں اس کی غلط فہمی اسی وقت سامنے آجاتی ہے اور اسے اسی وقت رفع کیا جا سکتا ہے۔ اپنے ماحول میں انسان اپنے مسائل میں اس طرح جکڑا ہوا ہوتا ہے کہ اس کے پاس کوئی دوسری بات سننے کے لیے وقت نہیں ہوتا ہے، جب وہ اپنے ماحول کے خول سے باہر آتا ہے تو پھر دوسرے مسائل کے بارے میں

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سوچنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ تربیت گاہ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان پوری دینی فضا میں کچھ وقت گزارے گا تو دین اس کے اندر استحکام حاصل کر لے گا۔ اور جب وہ اپنے ماحول میں واپس آئے گا تو اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ اب غیر دینی ماحول میں صحیح زندگی گزارے گا۔

جن مصلحین نے بھی انسانوں کی اصلاح کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا، وہ بتاتے ہیں کہ جب لوگوں کو ان کے ماحول سے نکال کر دینی فضا میں رکھا گیا اور وہاں ان کے اوپر تعلیم وتربیت کا کام کیا گیا تو وہ بہت موثر ثابت ہوا۔ بے نمازی، زکوٰۃ نہ دینے والے، لڑائی جھگڑا کرنے والے، اور بدکاریوں میں لت پت نکلے اور واپسی پر وہ اس قدر تبدیل ہو چکے تھے کہ لوگ حیران ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ ایسی بھی مثالیں ہیں کہ بعض لوگ شراب کی بوتلیں ساتھ لے کر نکلے کیونکہ انھیں اصرار تھا کہ ہم شراب کو چھوڑ نہیں سکتے، مگر دینی ماحول میں شب وروز گزارنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود اپنے ہاتھ سے انھوں نے شراب کی بوتلیں توڑ ڈالیں اور تائب ہو کر مسلمان کی سی زندگی گزارنے لگے۔

المورد نے اپنے دعوتی کاموں میں ان تینوں باتوں کو بھی اختیار کر لیا ہے۔ ابھی اس ضمن میں کام کا آغاز ہے۔ فی الحال وسائل کی کمی کی وجہ سے یہ کام بھرپور طریقے سے نہیں کیے جا سکتے۔ مگر ان کی اہمیت کے پیش نظر ہم نے کام کی ابتدا کر دی ہے۔ جو لوگ ان کاموں میں کسی بھی حوالے سے شریک ہونا چاہیں، وہ راقم کے ساتھ رابطہ کر لیں۔ بچوں کے لیے نعیم احمد بلوچ صاحب اور خواتین کے لیے کوکب شہزاد صاحبہ کام کریں گی۔

——— محمد بلال

تخلیق زوجین

قرآن مجید کی سورۂ ذاریات میں ہے:

''اور آسمان کو ہم نے اپنی قدرت سے بنایا اور ہم وسیع القدرت ہیں۔ اور زمین کو ہم نے فرش کی طرح بچھایا سو ہم کیسے اچھے بچھانے والے ہیں۔ اور ہم نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا بنایا تا کہ تم نصیحت حاصل کرو تو اللہ ہی کی طرف دوڑو۔ میں تمھیں اللہ کی طرف سے واضح طور پر خبردار کرنے والا ہوں۔ اور اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود مت قرار دو۔ میں تمھیں اللہ کی طرف سے واضح طور پر خبردار کرنے والا ہوں۔''

یہ مضمون قرآن مجید میں بہت دفعہ آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو انسان کی افزایش کے لیے سازگار بنایا اور اس کی

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

نشو ونما کے لیے موزوں حالات مہیا کیے۔ان آیات میں انسان پر کی جانے والی انھی نعمتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان نعمتوں سے مستفید ہونے والے ہر ذی عقل انسان پر فرض ہے کہ وہ اپنے مالک اور منعم اللہ کی طرف لپکے اور اس کی الوہیت میں کسی کو شریک نہ کرے۔تخلیق کے عمل کا خاصہ ہے کہ یہ نر اور مادہ دونوں کے وجود کا محتاج ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ تمام حیوانات ونباتات میں زوجین پائے جاتے ہیں۔ان کے بغیر کسی ذی روح کی نسل برقرار رہ سکتی ہے نہ آگے چل سکتی ہے۔مخلوقات کے برعکس اللہ تعالیٰ زوج اور مثل سے بے نیاز ہے۔کسی نے اس کو جنا، نہ اس کی کوئی اولاد ہے۔وہ آپ سے موجود ہے اور از خود ہمیشہ رہے گا۔

یہ بات قابل غور ہے کہ زوجین کے ذکر کے فوراً بعد اللہ کی طرف لپکنے کا حکم ارشاد ہوا ہے۔گویا زوجین کا پایا جانا، ان کا باہم تعلق اور اس تعلق سے دنیا کی زندگی کا تسلسل ایسی بڑی نشانی ہے کہ اس پر غور کرنے سے خالق حقیقی تک پہنچا جا سکتا ہے۔آیا دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے؟ اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ جنس (Sex) اللہ کے احکام سے بے اعتنائی کا بڑا باعث بن گئی ہے۔ جنس مخالف کی طرف میلان اور دونوں جنسوں کے ملاپ سے جنم لینے والی اولاد سب اللہ سے غافل کر دیتے ہیں۔ایسا کیوں ہے؟ اس کی وجہ کائنات کی کاری گری کے فہم سے محرومی ہے جو فوری لذتوں میں منہمک ہو جانے سے جنم لیتی ہے۔انسان حال کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں اپنی توانائیاں صرف کر دیتا ہے اور مستقبل کی زندگی کا سامان نہیں کرتا۔یہ سمجھ لیا جائے کہ زوجین نسل حیوانی کی بقا اور دنیا کی گہما گہمی برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہیں تو اپنے اصل مقصد کی طرف نگاہ رکھنا ممکن ہو جاتا ہے۔

زوجین معنوی اشیا میں بھی پائے جاتے ہیں۔رات کے مقابلے میں دن ہے۔آسمان زمین پر سایہ فگن ہے۔سیاہی وسفیدی، صحت ومرض اور کھرا کھوٹا ایک دوسرے کی شناخت کراتے ہیں۔زوجین کا تضاد ایسی خاصیت ہے جس سے صحیح وغلط کی تمیز ہو جاتی ہے۔اسی تضاد سے گم راہی کے مقابلے میں وحی کا حق ہونا سمجھ میں آجاتا ہے۔کاش ہم زوجین کے اس سلسلے میں اپنی رہنمائی پا لیں اور ہم میں بھی اللہ کی طرف لپکنے کی خواہش پیدا ہو جائے۔

______ محمد وسیم اختر مفتی

ہانس کا سبق

پچھلے دنوں ایک حادثے میں میری ہنسلی کی ہڈی (Clavicle) ٹوٹ گئی۔ مجھے جسمانی تکلیف کا تو سامنا کرنا پڑا پر میرے لیے زیادہ تکلیف کی بات یہ تھی کہ میری روزمرہ کی سرگرمیوں میں رکاوٹ آ گئی۔ میں نے اپنے معمولات ترک نہ

کیے، مگر ان کو جاری رکھنا دشوار ہو گیا۔ کچھ وقت گزرا کہ میں نے ایک ٹوٹی ہڈی کو اپنے جسم کا جز و سمجھ لیا۔ اسی کے مطابق اپنا اٹھنا بیٹھنا کر لیا اور اس کے جڑنے کا محض انتظار کرنے کی بجائے اپنے معمولات اس کی سہولت کے مطابق ترتیب دے دیے۔

رفتہ رفتہ اس ہنسلی کے ٹوٹنے نے مجھے کئی سبق دیے۔ ایک آدمی سوچ سمجھ کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہوتا ہے۔ وہ سوچتا ہے، میں اتنے بجے پہنچوں گا، اپنا کام کروں گا اور اتنے بجے واپسی کی راہ لوں گا۔ مگر کچھ طاقتیں اس کے پروگرام میں حائل ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنی منزل پر پہنچنے کی بجائے اسپتال جا پہنچتا ہے۔ اسے اپنی جان کی فکر پڑ جاتی ہے اور وہ اپنا پروگرام بھول جاتا ہے۔ یہ طاقتیں اللہ تعالیٰ اور اس کے مقرر کردہ کارپردازان قضا و قدر ہیں۔ یعنی ہر ارادے کا پورا ہونا اللہ کی مرضی پر موقوف ہے۔ اسی لیے مسلمان کوئی کام کرنے سے پہلے اللہ سے توفیق مانگتا ہے۔ ارادہ کرنا، اس پر ثابت قدم ہونا، اسے بروے کار لانے کے وسائل مہیا کرنا، اس کی راہ میں درپیش رکاوٹوں سے نپٹنا اور اسے حسن انجام تک پہنچانا یہ سب مراحل اللہ کی توفیق ہی سے طے پاتے ہیں۔ ہمیں زندگی کا کوئی کام کرنے سے پہلے اس حقیقت کو ذہن سے محو نہیں کرنا چاہیے، ورنہ ناخوش گوار اتفاقات پیش آتے رہیں گے اور ان کی تاویل ہماری سمجھ میں نہ آئے گی۔

ایک ٹوٹے عضو کو انسان برداشت کر سکتا ہے، اس کے ساتھ کچھ وقت گزار سکتا ہے اور اس کے صحت مند ہونے تک اس کا لحاظ رکھ سکتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ وہ ایک مسلمان بھائی کو برداشت نہیں کرتا؟ وہ بھائی جس کے عقائد یا اخلاق میں کچھ شکستگی آ گئی ہے۔ جس طرح ایک عضو شکستہ کا دھیان رکھ کر، اسے صحت مند ہونے کی مہلت دے کر ہم اس سے کام لینے کی توقع کر لیتے ہیں ایسے ہی ایک منقطع آدمی کا خیال یا معالجہ کر کے اس کے بحال ہونے کا انتظار کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک مفید انسان بن جائے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مصیبت بڑی ہو یا چھوٹی ٹل جاتی ہے۔ واویلا کریں یا صبر، بیماری یا پریشانی اپنا وقت گزار کر رخصت ہو جاتی ہے۔ لہٰذا صبر اور وقار کے ساتھ ان کا سامنا کرنا بہتر ہے۔ جو لوگ شور و غل کرتے ہیں ان کا وقت بھی کٹ جاتا ہے، لیکن ایسے ان کا ظرف ظاہر ہو جاتا ہے۔

وقت آگے کی طرف بڑھتا ہے۔ ایک حادثہ ہو جانے کے بعد اس کی 'Management' (معالجہ اور دوا دارو کی تدبیر) کا خیال کرنا مفید ہوتا ہے اور اس سے حادثے کے اثرات زائل کرنے میں مدد بھی ملتی ہے۔ لیکن اگر ہم محض حادثے کے اسباب پر غور کرتے رہیں، ایک دوسرے پر الزام دھرتے رہیں اور آیندہ وقت جو علاج کے کام آ سکتا ہے، گنوا دیں تو ایک حادثے سے کئی حادثے جنم لیں گے اور ہماری تکلیف کئی چند بڑھ جائے گی۔ خیال ماضی کا فائدہ تبھی ہے اگر وہ آیندہ بچاؤ کی تدبیر کا کام دے، لیکن اگر اس سے محض زخموں پر نمک پاشی ہی ہوتی ہو تو اس سے پرہیز کرنا بہتر ہے۔

ہانس (Clavicle) کا یہ سبق اس وقت میرے ذہن میں خوب تازہ ہے، مگر کچھ وقت گزرے گا کہ میں اسے بھول جاؤں گا۔ ایک ہلکی سی یاد میرے دل میں ہو گی پر بدن پر اثر نہ کرے گی الا کہ کوئی نیا حادثہ (Shock) یہ سبق یاد دلا دے۔ غیر معمولی

حالات انسان کے جسم و جان پر گہرا اثر رکھتے ہیں اور کئی بھولے سبق یاد دلا دیتے ہیں، ورنہ حقائق کا ذہن سے محو ہو جانا شاید اس دنیا کا بڑا المیہ ہے۔

____ محمد وسیم اختر مفتی

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ریحان احمد یوسفی

''کائنات کی تخلیق''

مصنف: ہارون یحییٰ،
مترجم: علیم احمد،
ضخامت: ۱۹۱،
قیمت: ۱۵۰،
ناشر: گلوبل سائنس ملٹی پبلی کیشنز، ۱۳۹۔سنی پلازہ، حسرت موہانی روڈ، کراچی ۷۴۲۰۰۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

خدا کا تصور اس دنیا میں انسان کے جینے کی سب سے بڑی اساس ہے۔ نظری طور پر تو خدا کے وجود کے بارے میں ایک سے زیادہ آرا موجود رہی ہیں مگر عملاً انسانوں کی غالب ترین اکثریت ہمیشہ کسی مافوق الفطری طاقت کو مانتی رہی ہے۔ نبیوں نے ہر دور میں آکر لوگوں کو یہ بتایا کہ یہ طاقت اور یہ ہستی اللہ تعالیٰ کی ذات والا صفات ہے۔ تاہم یورپی نشاۃ ثانیہ میں مذہبی جمود اور انتہا پسندی کے ردعمل کے طور پر مذہب اور خدا کی گرفت انسانوں پر ڈھیلی پڑ گئی اور مادہ پرستی کا چلن عام ہونے لگا۔ بالخصوص انیسویں صدی میں سائنسی ترقی جس مقام پر پہنچی اس نے کم وبیش یہ بات طے کر دی کہ خدا کا تصور ماضی کا ایک افسانہ تھا جو توہم پرست انسانوں نے اپنی کم علمی کی بنا پر گھڑ لیا تھا۔ یہ کائنات اور جو کچھ اس میں نظر آتا ہے وہ محض بخت واتفاق کی کارفرمائی ہے جس کے پیچھے کوئی شعور اور ارادہ موجود نہیں۔

یہ صورت حال زیادہ عرصے تک جاری نہ رہ سکی۔ بیسویں صدی میں سائنسی تحقیقات نے جو رخ اختیار کیا وہ بالکل برعکس نتائج دینے لگا۔ فطرت کے مطالعے کے جدید ترین آلات جب وجود میں آئے تو معلوم ہوا کہ یہ کائنات جن اصولوں پر چل رہی ہے وہ اتنے محکم اور منظّم ہیں کہ یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے پسِ پشت کوئی خارجی ارادہ کام نہ کر رہا ہو۔ کائنات کا یہ ربط ونظم اتنا حیرتناک تھا کہ اسے صرف کوئی اندھا ہی نظر انداز کر سکتا تھا۔ اسی صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے آئن اسٹائن

نے کہا تھا:

"There are only two ways to live your life. One is as though nothing is a miracle. The other is as though everything is a miracle."

''زندگی گزارنے کی دو ہی سطحیں ممکن ہیں۔ایک وہ جس میں کوئی چیز معجزہ نہیں لگتی۔ دوسری وہ جس میں ہر چیز معجزہ لگتی ہے۔''

دورِ جدید کی ان دریافتوں کی بنیاد پر متعدد غیر مسلم اور مسلم اسکالرز نے مادیت پرستی اور الحاد کے خلاف علمی جنگ کی ہے۔ان میں سے ایک ممتاز نام جناب ہارون یحییٰ کا ہے۔ترکی سے تعلق رکھنے والے ہارون یحییٰ نے یوں تو متعدد میدانوں میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں مگر انکا خاص میدان، جو ان کی اصل وجۂ شہرت بھی ہے،سائنسی حقائق کے ذریعے خدا کے وجود اور قرآن کی حقانیت کا اثبات ہے۔انہوں نے مثبت طور پر یہ کام کرنے کے ساتھ ساتھ ان نظریات کے ابطال پر بھی بڑا کام کیا ہے جو انکارِ خدا اور مادیت پرستی کی علمی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا اور مشہور نظریہ ارتقاء کا ہے۔چنانچہ سائنسی بنیادوں پر اس کا رد مصنف کا خصوصی شعبہ رہا ہے۔اپنے اس کام کو وہ محض ایک تحقیقی عالم کے مقام سے سر انجام نہیں دے رہے بلکہ اسے ایک مشن کے طور ر چلا رہے ہیں۔اس مقصد کے لیے انہوں نے ترکی میں ایک ادارہ ''سائنس ریسرچ فاؤنڈیشن'' کے نام سے قائم کیا ہے جو بین الاقوامی سطح کی کانفرنسیں منعقد کرتا رہتا ہے۔کتابوں کے علاوہ مصنف نے آڈیو، ویڈیو،سی ڈی اور ویب سائٹس وغیرہ کے ذریعے اس کام کو بڑے پیمانے پر پھیلایا ہے۔ان کی اس کاوش کو بین الاقوامی طور پر بڑی پزیرائی حاصل ہوئی ہے۔دنیا بھر کے ممتاز ٹی وی چینلز ان کے ویڈیو دکھاتے ہیں۔ان کے مضامین اہم جرائد و رسائل اور ویب سائٹس کی زینت بنتے ہیں۔انہوں نے ۱۷۰ سے زائد کتب تحریر کی ہیں اور دنیا کی بیس زبانوں میں ان کی کتابوں کا ترجمہ ہو چکا ہے۔جس میں ہماری اردو زبان بھی شامل ہے۔

زیرِ نظر مضمون میں ہم ان کی کتاب The Creation of The Universe کے اردو ترجمہ کا ایک تعارف قارئین کے سامنے پیش کررہے ہیں جو حال ہی میں ''گلوبل سائنس ملٹی پبلی کیشنز'' نامی ادارے نے کیا ہے۔مترجم علیم احمد ہیں۔جنہوں نے بہت عمدہ طریقے سے ایک مشکل موضوع کا سادہ،آسان اور رواں ترجمہ کیا ہے۔ترجمے میں بعض اضافے اور تصیحات بھی کی گئیں ہیں جو مصنف ہارون یحییٰ کی نظرِ ثانی کے بعد کتاب کا حصہ بنادی گئی ہیں۔

کتاب آٹھ ابواب، تعارفی اور اختتامی مباحث اور ایک خصوصی ضمیمہ پر مشتمل ہے جو نظریۂ ارتقا کے رد میں لکھا گیا ہے۔کتاب کے آخر میں اشاریہ (Index) بھی دیا گیا ہے۔کتاب کا آغاز بگ بینگ (Big Bang) کے اس دھماکے کی تفصیلات سے ہوتا ہے جس کے نتیجے میں کائنات وجود میں آئی۔ پھر ایک ایک کرکے کائنات کے مختلف مظاہر مثلاً ایٹم، آسمان، زمین، پانی، روشنی وغیرہ کا بیان ہے۔مصنف کا طریقہ یہ ہے کہ ہر باب کے آغاز میں پہلے کسی سائنس دان کی

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

رائے نقل کی جاتی ہے۔ یہ سائنسدان متعلقہ شعبے کا کوئی ماہر ہوتا ہے۔ اپنے علم کی روشنی میں وہ جو رائے بیان کرتا ہے اس سے فاضل مصنف کے استدلال کو تقویت ملتی ہے۔ اس کے بعد مصنف سائنسی تحقیقات کی روشنی میں بالتفصیل یہ بیان کرتے ہیں کہ کائنات میں کوئی واقعہ کس طرح رونما ہو رہا ہے۔ وہ سائنسی حقائق بیان کرتے ہوئے اس مظہر میں کارفرما نظم اور ربط واضح کرتے ہیں۔ جس سے یہ بات بالکل نمایاں ہو کر سامنے آ جاتی ہے کہ اس سب کے پیچھے ایک ارادہ اور شعور کام کر رہا ہے۔ باب کے آخر میں مصنف قرآن کی کچھ متعلقہ آیات بیان کرتے ہیں جو واضح کر دیتی ہیں کہ یہ ارادہ اور شعور خدا کا ہے۔

کتاب کا بنیادی خیال مادہ پرستوں کی ان دونوں دلیلوں کی بے معنویت واضح کرنا ہے جن کی بنیاد پر انکارِ خدا کا تصور عام ہوا۔ یعنی کائنات ہمیشہ سے ہے اور اس زمین پر نظر آنے والی زندگی کسی اتفاق کا نتیجہ ہے۔ وہ جدید سائنسی تحقیقات کی روشنی میں یہ واضح کرتے ہیں کہ یہ کائنات ابدی نہیں بلکہ ابدی خدا کی تخلیق ہے۔ اسی طرح یہاں موجود زندگی اتفاق سے وجود میں نہیں آئی بلکہ ان موزوں حالات کا نتیجہ ہے جو ایک خالق نے یہاں قائم کر رکھے ہیں۔

مصنف کی پوری کتاب انھی دو باتوں کی تفصیل کرتی ہے۔ وہ کتاب میں مختلف مظاہر کائنات کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے اپنے نقطۂ نظر کو سائنسی بنیادوں پر ثابت کرتے ہیں۔ ان کے استدلال کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے کیا جا سکتا ہے جو کتاب کے آخری باب سے لیا گیا ہے۔ جہاں وہ اپنے دلائل کا خلاصہ بیان کرتے ہیں۔

> ''بگ بینگ سے ہونے والے کائناتی پھیلاؤ سے لے کر ایٹموں کے طبیعی توازنوں تک، چاروں کائناتی قوتوں میں مضبوطی کے فرق سے لے کر ستاروں میں بھاری عناصر کی تیاری تک، خلا کی جہتوں میں عیاں پراسراریت سے لے کر نظام شمسی کی ترتیب و تنظیم تک......ہم کائنات کے جس گوشے کی طرف بھی نظر اٹھاتے ہیں، وہاں ہمیں ایک جچا تلا اور غیر معمولی نظم وضبط دکھائی دیتا ہے......مختصر یہ کہ ہے جب بھی ہم کائنات کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ہمارا سامنا ایک غیر معمولی صورت گری سے ہوتا ہے۔ جس کا مقصد انسانی حیات کی نشوونما کرنا اور اسے تحفظ فراہم کرنا ہے......اس صورت گری کے نتائج بھی بہت واضح ہیں۔ کائنات کی تمام تر جزئیات میں پوشیدہ یہی ڈیزائن یقینی طور پر ایک عظیم ترین خالق کی موجودگی کا ثبوت ہے جو کائنات کے ایک ایک جز کو قابو کیے ہوئے ہے۔ اور جس کی قدرت اور دانائی لامحدود ہے۔ بگ بینگ کے نظریے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ وہی خالق ہے جس نے کائنات کو عدم سے تخلیق کیا۔'' (صفحہ ۱۴۲ تا ۱۴۳)

جیسا کہ مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہے کہ مصنف نے کائنات میں موجود نظم (Design) کو اپنے بنیادی استدلال کے طور پر پیش کیا ہے۔ مصنف کے اس استدلال کی کیا اہمیت ہے اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ دور جدید کے عظیم ملحد فلسفی برٹینڈ رسل نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب Why I am not a Cristian کے دیباچے میں میں اسی Argument of Design کو خدا کے وجود پر سب سے مضبوط دلیل قرار دیا ہے۔ گو وہ ڈارون کے نظریۂ ارتقا کی بنیاد پر

اس دلیل کو رد کرتا ہے مگر جیسا کہ قارئین دیکھیں گے کہ مصنف نے کتاب کے آخر میں نظریۂ ارتقا کی عدم صحت کے تمام دلائل بخوبی جمع کر دیے ہیں۔ جہاں تک نظم کے استدلال کی مضبوطی کا تعلق ہے تو قارئین کو اس کا اندازہ اس وقت ہوگا جب وہ کتاب میں دی گئی ان تفصیلات کو پڑھیں گے جو کائنات میں موجود نظم کے حوالے سے مصنف نے جمع کی ہیں۔

سچی بات تو یہ ہے کہ خدا کے وجود کے حق میں جدید سائنس نے اتنی شہادتیں جمع کر دی ہیں کہ خدا کو نہ ماننا اب سائنس نہیں بلکہ توہم پرستی کی بنیادوں پر ہی ممکن ہے۔ اس بات کو بیان کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں۔

''آج نوبت یہ آگئی ہے کہ مادہ پرستی بجائے خود توہمات اور غیر سائنسی عقیدے پر مشتمل نظام میں تبدیل ہو چکی ہے۔ امریکی ماہرِ جینیات رابرٹ گرفتھس اس روش کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر ہمیں بحث کرنے کے لیے کسی ملحد کی ضرورت پڑی تو میں شعبۂ فلسفہ کا رخ کروں گا۔ اس کام کے لیے شعبۂ طبیعیات کچھ کام کا نہیں۔'' (صفحہ ۳۶)

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کے متوقع قارئین کی توجہ بعض باتوں کی طرف مبذول کرا دی جائے۔ موجودہ دور میں مادیت پرستی نے جس طرح پوری دنیا کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے اس میں لوگ خدا کو مان کر بھی اس کا انکار کر دیتے ہیں۔ یہ کتاب پڑھ کر لوگوں کا اندازہ ہوگا کہ جس ہستی کو خدا کہا جاتا ہے وہ کس قدر طاقتور، ہیبت ناک حد تک بلند و عظیم اور صاحب جبروت و صاحب اقتدار ہے۔ ساتھ ساتھ یہ بھی اندازہ ہوگا کہ کیسی حکیم، علیم، کریم، حلیم اور مہربان ہستی ہے۔ جب کوئی صاحب دل انسان ایسی کسی چیز کا مطالعہ کرتا ہے تو اس سے فوری طور پر صرف دو ردعمل متوقع ہیں۔ یا تو اس کی زبان بند ہو جائے گی، ہونٹ سل جائیں گے اور وہ گنگ ہو کر رہ جائے گا۔ یا پھر وہ اس طرح چیخیں مار کر روئے گا کہ ہچکیاں اور آنسو تھمنے کا نام نہ لیں گے۔ بیشک اللہ کے بندوں میں سے وہی اس سے ڈرتے ہیں جو علم رکھنے والے ہیں (فاطر ۳۵: ۲۸)۔

بدقسمتی سے آج کا مسلمان ایسی چیزوں سے بھی بڑی غلط غذا لیتا ہے۔ ایسی کتابیں مسلمانوں میں صرف اس لیے مقبول ہیں کہ وہ انکے جذبہ فخر کی تسکین کرتی ہیں۔ مسلمانوں پر ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ پیدائشی طور پر حق پر ہیں اور باقی تمام لوگ باطل پر ہیں۔ حالانکہ قرآن ایسی صورتحال میں عقل والوں کا رویہ یوں بیان کرتا ہے کائنات میں خدا کی نشانیاں دیکھ کر ان کا ذہن بے اختیار آخرت کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''بے شک آسمانوں اور زمین کی خلقت اور رات اور دن کی آمد و شد میں اہل عقل کے لیے بہت سے نشانیاں ہیں۔ ان کے لیے جو کھڑے، بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر خدا کو یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی خلقت پر غور کرتے رہتے ہیں۔ (وہ کہہ اٹھتے ہیں کہ) اے ہمارے پروردگار تو نے یہ کارخانہ بے مقصد پیدا نہیں کیا ہے۔ تو اس بات سے پاک ہے (کہ کوئی کام بے وجہ کرے)۔ سو تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔'' (آل عمران ۳: ۱۹۰-۱۹۱)

ہم نے برسرِ موقع یہ تنبیہات اس لیے کیں کہ کتاب کے تعارف کے ساتھ کتاب پڑھنے کا صحیح طریقہ بھی واضح رہے۔ کتاب ان قارئین کے لیے تھوڑی سی مشکل ثابت ہوگی جن کی ابتدائی تعلیم سائنس میں نہیں ہوئی۔ گو تصاویر، سادہ زبان

اور عام فہم مثالوں کے ذریعے یہ مشکل کافی حل ہو جاتی ہے۔کتاب کا سرورق عمدہ ، کاغذ اور طباعت کا معیار بہت اعلیٰ ہے۔البتہ فونٹ قدرے چھوٹا ہے جس سے بعض لوگوں کو پڑھنے میں دقت پیش آ سکتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کتاب اپنے مقصد کے اعتبار سے ایک انتہائی کامیاب تصنیف ہے۔ضروری ہے کہ اسے جدید تعلیم یافتہ طبقے تک پہنچایا جائے۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

— جاوید

O

اس پر ہوا ہے دہر میں اپنا سفر تمام
آشفتۂ فرنگ ہیں علم و ہنر تمام

عالم بھی تھا نگاہ میں، لیکن زہے نصیب
اب اُن کی نذر کردیا ذوقِ نظر تمام

دیکھا ہے جب بھی حسن کو فطرت میں بے نقاب
زنداں لگے ہیں شہر کے دیوار و در تمام

اُس دن کی خیر جس میں بہ صد شوقِ آگہی
برپا ہوا یہ معرکۂ خیر و شر تمام

سنتے کہیں تو حسن و محبت کی داستاں
اِس شہر کے خطیب ہوئے نوحہ گر تمام

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اپنے ہی سنگ وخشت سے ہر سُو اٹا ہوا
صدیوں سے دیکھتا ہوں تری رہ گزر تمام

بزمِ سخن میں تیرگی شب تھی روبرو
لایا ہوں اپنی خاک میں پنہاں شرر تمام

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org